سفر گزار

(دیوانِ راہی)



جنا پشاور راہی

سفرگزار

(دیوانِ راہی)

غزلیات

اور

چوراسی اوزان میں رباعیات

(پہلی بار)

SAFARGUZAR

(Collection of Poetry)

By : Jamna Parshad Rahi
8/10 Shakuntla Kutir, Raghubeer Puri
Aligarh - 202001
Mob. 08476923024

نام شاعر	:	جمنا پرشاد راہیؔ
پیدائش	:	۱۹۴۰ء ریاست بھیکم پور ضلع علی گڑھ
نام کتاب	:	سفر گزار
اشاعت اول	:	۲۰۱۲ء
تعداد	:	ایک ہزار
طباعت	:	مشکوٰۃ پرنٹرس، علی گڑھ، 09897674550
مصنف وناشر	:	جمنا پرشاد راہیؔ
صفحات	:	۲۱۶
قیمت	:	۳۵۰ روپے (Price Rs. 350/-)
بیرونی ممالک	:	۱۵ ڈالر (15 $ USD other Contries)

کتاب ملنے کے پتے:

۱- اُپکار پبلکیشن ۱۰/ ۸ شکنتلا کٹیر، رگھوبیر پوری، علی گڑھ
۲- مکتبہ جامعہ علی گڑھ/ دہلی/ ممبئی
۳- ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

تقسیم کار:

اُپکار واچ کمپنی رگھوبیر پوری، نمائش روڈ، علی گڑھ

جمناپرشاد راہی

نگارشات

۱۔ سرابوں کی فصل شعری مجموعہ
۲۔ بانسری کی دھن ترجمہ
۳۔ ایک اور بازگشت ترجمہ
۴۔ اور دریچے سلگتے رہے ترجمہ
۵۔ سفر گزار زیر نظر شعری مجموعہ
۶۔ ''ابلاغ عروضِ'' رموزِ فن (زیر تکمیل)

اعزازات

۱۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی ایوارڈ ۱۹۸۵ء
۲۔ ماسٹر ایوارڈ لندن (انگلینڈ)
۳۔ شِکھر شری ایوارڈ علی گڑھ (بھارت)

برائے مراسلت ورابطہ:

۱۔ ۱۰/۸ شکنتلا کیٹر فون: ۰۵۷۱۲۵۱۱۲۲۱
رگھوبیر پوری، علی گڑھ
۲۔ اُپکار واچ کمپنی ۱۸۴/۸ گومتی سدن
نمائش روڈ، علی گڑھ
۳۔ اُپکار الیکٹروپلیٹرس
۹۴/۸ رگھوبیر پوری علی گڑھ
موبائل: 08476923024 (ذاتی)

انتساب!

ایمانِ غزل تم ہو
عنوانِ غزل تم ہو
ہر شعر کی بندش میں
اے جانِ غزل تم ہو

شکنتلا کے نام!
جمنا پرشاد راہیؔ
۲۵ر جون ۲۰۱۲ء

نہ فاصلے نہ ہواؤں کی مسئلہ سازی
''سفر گزار'' پرندہ ابھی اڑان میں ہے
راہیؔ

راہ شعر کا نادرہ کار

جمنا پرشاد راہی

جمنا پرشاد راہی کو میں چالیس سال سے جانتا ہوں۔ علی گڑھ آیا تو یونیورسٹی کی محفلوں کے علاوہ خلیل الرحمان اعظمی اور وارث کرمانی جیسے ادیبوں نے بھی انجمنیں بنا رکھی تھیں جن میں ہم یونیورسٹی والوں کے علاوہ شہر کے شاعر اور ادیب بھی شریک ہوتے تھے۔ جمنا پرشاد سے میرا تعارف انھیں جلسوں میں ہوا وہ شہر کے محترم شاعر مختار ہاشمی مرحوم کے شاگرد ہیں، اور رمز آفاقی سے عروض کے رموز سیکھتے اور ان کی باریکیوں پر غور کرتے رہے ہیں۔ اُن دنوں وہ قریب قریب ہر شام پہلے گھنٹہ بھر خلیل الرحمان کے ہاں گزارتے کہ اتنے میں اختر انصاری کی محفل برپا ہو جاتی، اور جاتی رات کے ساتھ جوان ہوتی۔ راہی اس میں اختر انصاری کے اور اُن کی زبانی نہ جانے اور کتنے صاحبان فن کے اشعار سنتے اور گرہ میں باندھ لیتے۔ اُس زمانہ میں انھوں نے ''سرابوں کی فصل'' کے نام سے اپنی غزلوں کا مجموعہ اختر انصاری کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ وزیر آغا کے ''اوراق'' اور طفیل احمد کے ''نقوش'' میں چھپتے رہے۔ بلدیو مرزا کے تعاون سے، اِلس فرٹزل Ellisfritzel کے Contact Pipe کو اردو میں ''بانسری کی دھن'' بنایا۔ عائشہ ظہیر ووچ کی کتاب کا ترجمہ ''ایک اور بازگشت'' نام سے کیا۔ اولیور فرگ ری Oliver Fregry کی کتاب کو ''اور دریچے سلگتے رہے'' لکھا۔ اور کچھ غیر ملکی انتخابات Anthologies میں شامل ہوئے اور پھر پچیس تیس سال تک ایسے رہینِ روزگار رہے کہ اُردو ادب کا بازار انھیں بھول گیا۔ یاد رکھا تو شہر

کے نئے لکھنے والے شاگردوں نے ، یا جنھوں نے اُن کی کتابیں اوران کا مرتب۔
کردہ اُستاذ مختار ہاشمی کا دیوان ''گردشِ رنگ'' پڑھا۔

اب جمنا پرشاد راہیؔ ''عمر کے پختہ اُستادانہ''، معنی آفریں اور فکرِ امروز کے اُن منفرد اشعار کا مجموعہ لے کے سامنے آئے ہیں، جن کا ترفع اصغر گونڈوی کی یاد دلاتا ہے، اور نازک فارسی بندشیں غالبؔ اعظم کی۔ راہیؔ کی عروضی جدتیں اپنی آپ مثال ہیں۔ بحرِ ہزج میں عروضی غزل لکھی، جس کے ہر مصرعہ میں بذریعۂ زحافات ایک نیا وزن ہے۔ رباعی کے ۲۴ اوزان کو ۸۴ تک وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر ان کا نوٹ کتاب میں شامل ہے۔ جمنا پرشاد ایک حقیقت شناس عالمی انسان ہیں۔ ان کا رویہ ترقی پسندانہ ہے، مگر اُن کی شخصیت کی طرح اُن کی شاعری بھی کسی دھڑے بندی، تعصب یا منافقت سے پاک ہے۔ اُنھیں ذاتی واردتوں، ماضی کی یادوں اور ادبی روایت سے مَس ہے، مگر وہ انہیں اپنے رنگ میں نیا پن دے کر کہتے ہیں۔ جو بات ان کے دل کو لگی ہے، وہ انسانی بہبود، ہوش مندی اور مستقبل آفرینی ہے۔ استعارہ بالکنایہ انھیں بہت مرغوب ہے، اور وہ اکثر نام لیے بغیر کسی وجود، کسی حقیقت، یا کسی خیال کی اس طرح تعریف کرتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والا سیاق وسباق سے سمجھ لیتا ہے۔ ندرتِ فکر و بیان اُن کی شناخت ہے، کوئی معلوم بات کہتے ہیں تو عام ڈگر سے ہٹ کے، اس میں نیا پہلو نکال کے، بعض وقت رائج تصورات کے برخلاف بات ڈھونڈ کے، جس سے جواز پیدا ہوتا ہے کہ وہ کچھ کہتے ہی کیوں ہیں۔ وہ مایوس حالات میں حوصلہ مندی پیدا کرتے ہیں، اور اس ایمان کا ثبوت دیتے رہتے ہیں کہ ع دنیا بھی کسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے، ساقی (شفیقؔ جونپوری)۔ غالبؔ کی پیروی میں ترکیب در ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ جو مضمون آفریں ہیں، نئے مفاہیم ڈھونڈ لیتے ہیں، اور نئی نئی ترکیبوں کا انبار لگاتے ہیں، جیسے پروردگارِ شب، صدانوشی، تعبیر طرف، سرِ چشم صدف، نیرنگیِ میزانِ ہدف، اصنامِ سری، آئینہ سر، خفتہ روی، ترسیلِ خواہشات،

اُجالوں کا جل ترنگ، پگھلی سی نکہتیں، طرزِ تیشہ نوائی، نقش بہ قرطاسِ غزل۔

عام طور پر مجموعۂ کلام پر لکھنے کے لیے وہ اشعار ڈھونڈے جاتے ہیں جنھیں پیش کرنے سے ممدوح کی شاعری کی اچھی تصویر سامنے آئے۔ جمنا پرشاد کا یہ مجموعہ پڑھتے وقت مجھے یہ کوشش کرنی پڑی کہ بہت سے اچھے اشعار کیسے نظر انداز کروں کہ زیادہ اچھے اشعار اتنے چن لوں جنھیں اپنی سطروں میں پیش کرنا طویل کلامی نہ لگے۔

یہ عام باتیں کہنے کے بعد، اب میں ان کے اشعار سے اپنی رائے کی توثیق کروں گا۔

لکھتے ہیں:

پھر وہی سنسان بستی پھر وہی ویراں کھنڈر
نیند جب ٹوٹی تو سمجھے خواب تھا دیکھا ہوا

سرسری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوابِ پریشاں بیان کیا ہے جو شاعر کو بار بار نظر آتا ہے، اور آنکھ کھلنے پر اُس کے صرف خواب ہونے سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ لیکن بات یہ نہیں۔ آنکھ کھلنے پر وہی سنسان بستی، وہی ویراں کھنڈر سامنے آتے ہیں جو زندگی کا معمول ہیں۔ اُن کے نفسیاتی ردِ عمل میں، متخیلہ کی حسرت نے کون سے 'منقش در و بامِ محرابیں اور گل و گلزار دیکھے انھیں شاعر بیان نہیں کرتا، صرف اپنے پڑھنے یا سننے والوں پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ تصور کریں، کیا تھا۔ اور وہ ایسا کر لیتے ہیں۔

اُن کی غزل کی یہ ایک بڑی خوبی ہے۔ راہی کہتے ہیں:

بے رمز و کنایات غزل کیا معنی؟
مفہوم بہ الفاظِ دِگر پیدا کر

اس جسمِ جہاں ساز کو سر کرنے میں
بستر پہ شہنشاہ بھی کم جاہ لگے

یہاں حرفِ اشارہ 'اِس' بھی ہو سکتا ہے، جب جسم شہنشاہ کا ہوگا، اور 'اُس' بھی جس سے مراد معشوق کا جسم ہوگا۔ دونوں صورتوں میں شعر گہری عملی بصیرت کا غماز ہے۔

اب معشوق کے جسم کی ایک جھلک دیکھ لینے کی تاب جمع کیجیے:

لباسِ رنگ سے جھانکے جو مرمریں سا بدن
حصارِ سنگ سے باہر شرارِ سنگ لگے

ایک جملہ کے شعر میں تین تشبیہیں اور استعارے، بدن لباسِ رنگ کے اندر مرمریں سا' باہر شرارِ سنگ کا اجمال اور شرارت، لباسِ رنگ کا شعبدہ مستزاد!

شہنشاہ کی یہ مجبوری دیکھنے کے بعد، اب جمنا پرشاد کی شہنشاہی ملاحظہ ہو:

ہم رنگِ فقیری میں تہی دست کبھی
اوقات پہ آئے تو شہنشاہ لگے

یہ سادہ شعر بھی:

سروری میں حوصلہ ہرگز نہ کھونا چاہیے
کیا کسی مختار کو مجبور ہونا چاہیے

کئی معنی رکھتا ہے۔ 'سروری میں' کا مفہوم 'سروری کی صورت میں' بھی ہوسکتا ہے اور 'سروری کے حصول کی کوشش میں بھی'، یعنی شاعر نہ کم حوصلگی پسند کرتا ہے کہ سروری حاصل ہے تو اب اور کیا چاہیے، اور نہ یہ مایوسی کہ ہم کچھ ہیٔ نہیں تو کیا کریں۔ پہلی صورت تو ظاہر ہے، دوسری صورت میں انسان کو یہ دونوں اختیارات حاصل ہیں کہ وہ سروری کے حصول کے لیے کوشش کرے، اور وہ نہ حاصل ہو تو دوسری باتوں کے لیے کوشاں رہے۔

اختیار اور حوصلہ کی بات آئی ہے تو اُس کے اوجِ کمال پر پہنچیے:

ہم جرأتِ رفتار کا دم بھرتے ہیں
مشکل سے کہو اور کسی راہ لگے

پہلے مصرع کی مناسباتِ لفظی غور طلب ہیں، اور

ہمارے سائے میں سورج پناہ لیتا ہے
شعاعِ کرب نہ ٹکرا کہ ہم میں دیواریں

پہلے مصرعے میں حسنِ تعلیل کا لطف اٹھائیے اور دوسرے مصرع میں قوتِ برداشت پر آفریں کہیے۔

معدوم ہیں اس موڑ سے کچھ نقش کفِ پا
روودادِ سفر میں کوئی افسانہ تلف ہے

یہ شعر ذاتی زندگیوں کی جدوجہد کے علاوہ ہماری تاریخ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ایک مثال یہ دوں کہ میرے لڑکپن میں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور علی برادران تحریک آزادی کے اہم رہنما تھے، مگر اب اُن کا کوئی نوجوان نام بھی نہیں جانتا۔

کھو کے کہیں آئے ہو تم اپنا ہی چہرہ
گھر کے کسی آئینہ پہ زنگ نہیں ہے

یہ شعر ذاتی زندگی کا تو ترجمان ہے ہی، اجتمائی، اور قومی زندگی پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اس سے مومن خاں کا شعر یاد آتا ہے۔

نہ سمجھے ہم نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

اب شدتِ تاثر کے سامنے انھیں بے رنگ آئنوں کی مجبوری دیکھیے۔ شاعر اور ادیب غمِ دیگراں کو یوں محسوس کرتا اور بیان کر دیتا ہے جیسے اس کی آپ بیتی ہو۔ اس لیے کہوں گا، راہی راستہ گلیوں سے ایسے بھی مضامین ڈھونڈ لاتے اور انھیں اس طرح سجا بنا کے پیش کرتے ہیں:

دیوارِ احتیاط سے بہنے لگا لہو
پرچھائیں کس کی آینے مجروح کر گئی؟

پرچھائیں نے کسی گوشت پوست کو متاثر نہیں کیا ہے، آئنوں کو چھلنی

کر دیا ہے، جو مادی بھی ہو سکتے ہیں اور تمثیلی بھی، جیسے آئینۂ دل، اور احتیاط کے عزم و ارادہ کی اُس مضبوط دیوار سے لہو جاری کر دیا ہے جو ہنوز گری نہیں، اپنی جگہ قائم ہے۔ لیکن بقول غالبؔ ع انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں، آخر کب تک؟ اور پھر:

میں بکھرا تو یک چشمِ زدن میں بکھرا
سمٹا تو سمٹنے میں کئی ماہ لگے

راہیؔ شائد اسی طرح کی بصیرت کے لیے اپنے استعاراتی اندازِ بیان میں کہتے ہیں:

پائی ہے سرابوں سے وراثت میں
وہ خاک جو دامانِ نظر میں ہے

اور یہ ورثہ آبائی سے کہیں بڑھ کے شاعرانہ ہے۔ شاعر کو کتنا بڑا صاحب دل ہونا چاہیے!

ابھی ایک پرچھائیں نے آئنے مجروح کئے تھے، اب دیکھئے پتھریلے الفاظ انھیں کس طرح یوں پارہ پارہ کرتے ہیں کہ اپنے شکست و ریخت میں انھیں خود مزا آ جاتا ہے:

پتھریلے الفاظ کی بارش آئینوں پر بار نہیں
لطفِ شکست و ریخت یہ شیشہ پارہ پارہ جانے ہے

فرائڈؔ یہ شعر سنتا تو کتنا خوش ہوتا۔ اقبالؔ نے آئنہ ٹوٹنے پر اُسے آئنہ ساز کی نگاہ میں عزیز تر کر دیا تھا، راہیؔ یہ لذت خود آئینہ کو بخشتے ہیں۔

اس کے بعد، آئنہ اُن کو خود شناسی کی منزل پر لے جاتا ہے تو وہ خاصی حیرت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں، جو بہت کم کو نصیب ہوتا ہے۔

میں آئینہ ہوں ہر اک صاحبِ نظر کے لیے
مگر خود اپنے ہی چہرے سے آشنا نہ ہوا!

اورخود شناسی کے ایسے مقامات پر پہنچ کر چلا اٹھتے ہیں۔ جیسے منصور اپنی کسی کیفیت میں فریاد کرتا کوچہ و بازار میں نکل جاتا تھا، بچاؤ مجھے بچاؤ، وہ مجھے نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے، بچاؤ مجھے بچاؤ۔

میں آگہی کی کڑی دھوپ سہہ نہ پاؤں گا
شعورِ ذات نہ دے انتہائے خاموشی

مجھے اقبالؔ پھر یاد آتے ہیں۔

عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

اپنے اپنے واردات، اپنے اپنے مقامات کی بات ہے!

خودشناسی کے اس موڑ پر یہ کئی طرح پہلودار شعر پڑھتا ہوں، جو اپنا اعترافِ عجز بھی ہے:

غرقِ انا بے تھاہ سمندر قابلِ یک جرعہ بھی نہیں
تشنہ لبی جانے کہ نہ جانے پانی کھارا جانے ہے

ابھی کل کی بات ہے کہ گھر تھا یا جنگل، رات کا اندھیرا ہوا کہ لاتعداد جگنو جگمگانے لگے۔ ایسا نفیس چراغاں کہیں اور نہ ہوتا تھا۔

جمنا پرشاد راہیؔ کو یہ خوش منظری خوب یاد ہے اور وہ اس کا بار بار ذکر کرتے ہیں، کبھی مشبّہ کے طور پر اور کبھی مشبّہ الیہ بنا کر، ملاحظہ ہو:

گم ہے نظر جگنوؤں کی دربدری میں
جیسے کوئی جشنِ انتشارِ شرر ہو

تیرگیِ شب نے کیا جادو کیا پچھلے پہر
دشتِ جاں تک جگنوؤں کا کارواں روشن ہوا

دوسرے شعر میں جگنوؤں کا کارواں اصلی نہیں، یہ ایک ذہنی اور جسمانی کیفیت کا استعارہ بالکنایہ ہے، جو صرف چند خوش قسمتوں کو مقسوم و مبارک ذہن وضمیر کی بیداری بھی ہو سکتی ہے۔ اس بات کو تیکھے تیوروں کے ساتھ موڑ دے کر اور تھوڑا ڈرامائی بنا کر ملاحظہ ہو:

کھو دیا کس نے ہوس ناک اندھیروں کا بھرم
فاحشہ شب کی سیہ کوکھ میں جگنو جاگے

ایک شخص دنیا و مافیہا سے بے خبر، غفلت اور معصیت، اور عشرت میں غرق تھا، کہ یکا یک کوئی مشاہدہ مثال کے طور پر جیسا کہ بھرتری ہری کو پیش آیا تھا ان کی کراہت اور بے وقعتی اُس پر کھول دیتا ہے اور اُسی عالم میں زندگی کی روشن بلندیاں اسے آواز دینے لگتی ہیں۔ بیان کی جھلملاتی تابانی مستزاد ہے۔ نئے پیغام کی کیفیت کے کچھ انداز کے لیے یہ بڑا شعر پڑھتے چلیے:

زندگی بن کے بکھر جائے مری راہوں میں
درد بن کر جو مری روح میں پلنا چاہے

آندرے ژید نے اپنی ناول 'تنگ دروازہ' کی ہیروئن کی ڈائری میں لکھا ہے، ''میرے مالک، اگر میں آپ تک پہنچتی ہوں تو صرف آپ کی وجہ سے پہنچوں گی، ژردم کی وجہ سے نہیں، یہ میں جانتی ہوں، مگر پھر آخر کیوں میرے اور اپنے درمیان ہر ہر قدم پر آپ اس کی تصویر بچھا دیتے ہیں؟'' یہ شعر راہیؔ کے اگلے پیمبرانہ شعر تک ہماری رہنمائی کرتا ہے جس کے مصرعے ضرب المثل بن جائیں گے:

اُگاؤ درد کی فصلیں کہ زندگی جاگے
لہو کی فصل اُگاتے ہوئے زمانہ ہوا

لہو کی فصل، اور درد کی فصل، میں کیا فرق ہے اور کتنا فاصلہ ہے، یہ اہل نظر زندگی کے

تجربہ سے جانتے ہیں۔ گزرے زمانہ کی یاد آ گئی ہے تو آیئے اس کے سفر پر راہی کے ساتھ یوں نکلیں کہ پچھلے نقوشِ پا روشن ہو جائیں:

ماضی کی گزر گاہ کبھی روشن کر
یادوں کے سفر پر بھی نکل جا اک بار

اور سفر میں راہیؔ کو ہم سب کی طرح ملال بھی ہوتا ہے، صدمے بھی، حیرت بھی، مگر اُس میں اُن کی جگ مگ تخئیل نئے نئے گل بھی کھلاتی ہے:

نیندیں سلگ رہی میں اُجالوں کی چھاؤں میں
حیران ہوں وہ سرد و سیہ شب کدھر گئی!
کیا دشتِ گرد و باد ہوا شہرِ آرزو
یا عمر آندھیوں کے سفر میں گزر گئی؟

اور وہ سفر اس اچھوتی حسرت پر تمام ہوا ہے:

ہم بھی خیال و فکر کے محور پہ گھومتے
کیا کیجئے کہ وقت کی گردش ٹھہر گئی!

اب آیئے رباعی کی بحر میں اس سرمست غزل کے ذریعہ اقبال کی روح کو آواز دیں کہ وہ لیونارد داونچی، فان خوخ اور فرمی کے تخلیقی آہنگ کے ہر جلوہ کو ایک پیغام بنا دے:

دیوارِ نگاہ پر ہے تصویرِ بہار
کچھ نقشِ گل و شاخ ابھی اور نکھار
تعبیریں دروازے پہ دیں گی دستک
خوابوں کے حصار میں کوئی شب تو گزار
دریائے مناظر کی تہوں میں تو اُتر
اپنی ہی نگاہ سے تو کیوں ہے بے زار
ہر نقشِ نہاں رنگِ نمو چاہتا ہے

تصویرِ کائنات ابھی اور نکھار

اب تعمیر اور تخلیق کے لیے خوش گفتاری کی کچھ مثالیں دیتا ہوں:

کچھ اور طرزِ تیشہ نوائی کو دھار دے

کہسارِ بے حسی میں شرارے اُتار دے

فکرِ رسا کو رنگ شناسِ بہار کر

شاخِ نہالِ فن کو نئے برگ و بار دے

بھٹک نہ جاؤں اندھیرے میں رہنمائی کر

کہ منزلوں کا اُجالا تری زبان میں ہے

خروشِ خواہشِ ہستی لہو میں ڈوب گیا

رگوں میں تیر رہی ہے نوائے خاموشی

اس کیفیت کی داد دیجیے کہ زندگی کچھ کر گزرنے کی خواہش کا ایسا سراپا بن گئی ہے کہ زبان کھولنے کی فرصت ہی نہ رہی:

ٹوٹ کر پتھر صدا دینے لگے کہسار سے

ضربِ تیشہ پڑ گئی شاید مری گفتار سے

کیا کسی بات کا اس سے زیادہ بھی اثر ہو سکتا ہے، یا اسے اس سے بڑھ کر بھی بیان کیا جا سکتا ہے؟

راہی کے بیان و معنی کا سلسلہ آگے بڑھانے سے پہلے، اُن کی عروضی غزل پیش کرتا ہوں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ فنی کاریگری کے مظاہرے معنی کی قیمت لے لیتے ہیں۔ لیکن جمنا پرشاد راہی کی اس غزل کا کوئی شعر اُن کے معیار سے گرا نہیں ہے۔ میں یہ غزل ہر مصرع کی تقطیع کے ساتھ نیچے درج کرتا ہوں۔ فن، لفظ اور معنی سب کی داد دیجیے:

ادراکِ خودی کا یہ اثر ہے   مفعول مفاعیل فعولن
آئینہ خود اپنی زد پہ ہے   مفعول مفاعلین فعلن
تصویر کشِ صحرا گھر ہے   مفعول مناعلین فعلن
کیا سازشِ دیوار و در رہے   مفعول مفاعلین فعلن
منظر منظر زہر اثر ہے   مفعولن مفعول فعولن
نیلا ہٹ تا حدِّ نظر ہے   مفعولن مفعول فعولن
پی جاؤ صداقت کا تلخاب   مفعول مفاعلین فعلان
اس زہر میں امرت مضمر ہے   مفعول مفاعلین فعلن
تصویریں عریاں ہیں پسِ رنگ   مفعولن مفعول فعولان
گستاخ بہت دستِ ہنر ہے   مفعول مفاعیل فعولن
آندھی نے سنیاس لیا تھا   مفعولن مفعول فعولن
برگد کیوں بے برگ و ثمر ہے   مفعولن مفعول فعولن
کیا دے کوئی زخموں کی داد   مفعون مفعولن فعلان
اپنا دل اپنا خنجر ہے   مفعولن مفعولن فعلن
صدیوں کا اندھیرا ہے سرِ راہ   مفعول مفاعیل فعولان
ہر چند کہ تو مہر بسر ہے   مفعول مفاعیل فعولن
آنکھوں میں ہے جشنِ بے خوابی   مفعول مفاعلین فعلن
گو گھر کی فضا خواب آور ہے   مفعول مفاعلین فعلن
شک ہو تو یک ضرب لگا دیکھ   مفعولن مفعول فعولان
پتھر میں پوشیدہ شرر ہے   مفعولن مفعول فعولن
موجوں میں لیے دردِ مساوات   مفعول مفاعیل فعولان
دریا ہوں صحرا پہ نظر ہے   مفعولن مفعول فعولن

راہیؔ یہ کارنامہ رباعی پر عروضی عبور کی بدولت انجام دے سکے ہیں، اور میری دانست میں انھیں یہیں سے اُس کے اوزان میں توسیع کی تجویز پیش کرنے کی تحریک ہوئی۔

اس کے بعد میں مشکل زمین میں راہی کی وہ غزلیں لیتا ہوں جو شائد طرحی ہوں، مارسل پروست، نے اپنی شہرۂ آفاق سوانحی ناول ''کھوئے دنوں کی جستجو'' کے پہلے حصّہ 'کومبرے ۲' میں اپنی ماں کے حسنِ قرأت کے ضمن میں لکھا ہے، ''جیسے شاعر مشکل زمینوں میں بہتر مضامین تلاش کر لیتا ہے''، لیکن جہاں ایسی ردیف کا معاملہ ہو، مصرع میں اُسے معنی خیز بنانا اصل کام ہوتا ہے۔ اب آپ یہ اشعار پڑھیں:

سونا پیتل رول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی
لوگو سب کو تول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

میری خوشبو تیرے تن میں بس جائے گی رفتہ رفتہ
خود کو تجھ میں گھول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

پلکوں کی میزان سنبھالے یادوں کی دوکان پہ تنہا
درد کی دولت تول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

مجھ جیسے کتنے ہی موتی ٹوٹ کے سستے بھاؤ بکے ہیں
لیکن میں انمول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

دنیا کے بازار میں بے شک جھوٹ کا سِکّہ چلتا ہوگا
لیکن میں سچ بول رہا ہو ماشہ ماشہ رتّی رتّی

عشق و محبت کی فاش باتیں کہیں نہیں، لیکن ذکرِ دنیا میں بھی ماحول تغزّل کا رہتا ہے۔ ہر شعر الگ بات کہتا ہے، مگر گمان وحدتِ خیال ہی کا ہوتا ہے۔ جیسے کوئی عاشق وفورِ شوق میں بولتا چلا جارہا ہو، اور ہم سن سن کر سرشار ہورہے ہوں اور بولنے والے کی صداقت پر ایمان لے آئے ہوں۔

غیر معمولی ردیف کے اسی سلسلہ میں چند شعر اُس غزل کے بھی لکھتا چلوں جو ''شاخوں پر'' ختم ہوتی ہے، اور جو فطرت کے تخئیلی بیان Subjective Discription کی عمدہ مثال ہے:

بجھے بجھے سے شرارے ہیں زرد شاخوں پر
سجا گیا ہے کوئی اپنا درد شاخوں پر
سفیرِ شب کا کوئی اشک ڈھونڈتے ہوں گے
ہوا کے جلتے ہوئے ہونٹ سرد شاخوں پر
عیاں ہے رنگِ تغزّل گلوں کے چہروں سے
بیاضِ رنگ نہیں فرد فرد شاخوں پر

زرد شاخوں سے بجھے بجھے شرارے نکالنا، اور اُن میں کسی کا درد دیکھ لینا، شبنم کو سفیرِ شب کہنا، گرم ہوا کا سرد شاخوں سے تضاد پیدا کرنا، اور تیسرے شعر میں انھیں زرد شاخوں کو، تردید اور حسنِ تعلیل کے ساتھ دو تشبیہیں دینا بڑی خوبی کی بات ہے۔ جمنا پرشاد نے شاعری میں مضامین کے ایسے انبار لگا رکھے ہیں کہ اتنے صفحہ لکھنے کے بعد بھی تمام نہ ہوئے۔ ضرب المثل ہے کہ صبح کا بھٹکا شام کو آ جائے تو برا نہیں۔ آپ اس پر راہیؔ کا اضافہ پڑھیے:

لوٹ بھی آیا تو صدیوں کی تھکن لائے گا
صبح کا بھولا ہوا شام کو گھر آنے تک

حسنِ تعلیل کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اب اُس کی دو مثالیں دیتا ہوں۔ پچھلی صدی میں جگدیش چند بوس اپنی اس بحث طلب تحقیق کے لیے مشہور ہوئے کہ نباتات بھی تکلیف، راحت، غم اور خوشی کا احساس کرتے ہیں۔ جمنا پرشاد راہیؔ کے مشاہدے کی داد دیجئے، وہ ثبوت دیتے ہیں کہ پتھر جیسے بے جان تک محسوس کرتے ہیں:

یہ سنگِ وخشت بھی احساس سے نہیں عاری
وہ دیکھو بارِ حقائق سے خم ہیں دیوار یں

اگلی مثال میں ایک پوری کہانی ہے۔ کوئی دشمن ایک مدت سے آستین میں چُھری لیے پھر رہا ہے مگر موقع نہیں پاتا۔ ایک دن موقع سے مل گیا تو شاعر نے طنز و تاویل کے ساتھ سمجھایا، دیکھ تجھ میں کُھلے عام حملہ کرنے کی ہمت نہیں، اور میں گھات لگانے کا موقع نہیں دوں گا۔ مفت میں اتنے دنوں سے ننگی چھری میں زنگ لگ رہا ہے۔ اب وہ تیری آستین میں بھر جائے گا تو تیرا نقصان بھی ہوگا اور بدنامی بھی، اس لیے اچھا یہی ہے کہ غصّہ تھوک دے، اور اسے الگ رکھ دے۔

بہت ہوا کہ اٹھا کر اسے نیام میں رکھ
پڑے پڑے نہ کہیں آستیں میں رنگ لگے

دشمن اس طرح کامیاب نہیں ہوا، تو شاعر یہ سوچ کر مزا لیتا ہے کہ اب وہ عاجز آ کے مجھے کوسے گا، وہ جو اِن باتوں کو مانتا ہی نہیں:

سورج کو بھی مغرب سے نکلتا دیکھوں
مصروفِ دعا کاش وہ بدخواہ لگے

چکبستؔ کا مشہور، سچا اور بہت ہی قابلِ قدر شعر ہے:

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

اس کے حوالے سے، میں راہی کا یہ شعر ضرب المثل کے طور پر یوں پڑھتا ہوں۔

ہر شخص پسِ پردۂ ترتیبِ عناصر
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہے

شاعر نے زیادہ نفاست سے علامتی انداز میں 'شخص' کے بجائے 'روح' کہا ہے، اور اُس کے لیے فعل 'کاٹ رہی ہے، آیا ہے۔

میں نے شروع میں ہی لکھا ہے جمنا پرشاد راہیؔ اپنے کمال تخئیل کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی صحت کی بنا پر حقیقت پسند ہیں۔ اب اس کی تین مثالیں دیتا ہوں، اور اُن کے تنوع کی وجہ سے تین طرح کی۔ پہلی ایک سادہ مشاہدہ ہے، وقت کے ساتھ ہر چیز بدلتی ہے، ہمیں اچھا لگے یا بُرا:

گھاٹ کے پتھر تھے ہم صدیوں کنارے پر رہے
رفتہ رفتہ کٹ گئے بہتی ندی کی دھار سے

ہمارے ادب میں خوابوں کا بڑا ذکر رہتا ہے، اور ہمیشہ تعریف کے ساتھ، حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ سوچنا چاہیے کہ کیا ممکن ہے اور عملی طور پر کیسے، ورنہ آدمی وہ ہو جاتا ہے جسے کچھ دنوں پہلے 'شیخ چلی' کہتے تھے۔ جاننے والے بتاتے ہیں کہ وہ موصوف خاصے قابل آدمی تھے، لیکن ان کے منصوبے بہت قبل از وقت تھے اور ان کے عملی پہلو پر بالکل غور نہیں کرتے تھے۔ اس بارے میں ہمیں ہوش میں لانے والے راہیؔ کا شعر یہ ہے:

کچھ تو سچّائی کے شہ کار نظر میں آتے
کاش ہم لوگ نہ خوابوں کے اثر میں آتے

اسی سلسلہ میں اک اور تنبیہ ملتی ہے، حکمت کی باتیں جو، بقول حفیظؔ جالندھری، شاعر لوگ نہیں کرتے:

یہ لوگ کوزے میں دریا بہت اُتارتے تھے
کبھی تو حادثۂ ناگزیر ہونا تھا

اس کے برخلاف، کائنات کی وسعت کے پیش نظر، ہم اپنی نگاہوں کو وسعت کیوں نہ دیں؟

زمیں کی گود میں کچھ اور بھی تو سورج ہیں؟
نظر کا دائرہ اتنا سکوڑتے کیوں ہو؟

اور:

تم ہر اک لفظ کا مفہوم بدل سکتے ہو
کاش بوسیدہ کتابوں سے چرالو مجھ کو

اور شاعر اپنی ان باتوں پر خوش ہوتا ہے:
اجنبی بھیڑ میں گم ہونے لگی تھیں آنکھیں
تم کہاں مل گئے اے میرے خیالوں مجھ کو!

تو مجھے عہد نامۂ قدیم کی وہ عبارت یاد آتی ہے کہ خدا چھ دن میں کائنات بنا کر خوش ہوا تھا۔

میں یہ تعارف شاعر کی اس دل سوز اپیل پر ختم کرتا ہوں:

کشتیاں ڈوب رہی ہیں کوئی ساحل لاؤ
اپنی آنکھیں مری آنکھوں کے مقابل لاؤ!
شعر و نغمہ کو نئی بندش نئے آیام دو
ورنہ عہدِ رفتگاں کا مرثیہ کہلاؤ گے

مجموعہ کے آخر میں شاعر کے نوٹ کے بعد اُس کی رباعیاں ہیں، پہلے رائج اخرب اور اخرم اوزان میں، اُس کے بعد شاعر کی اُپج والی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ انھیں بلا تبصرہ پڑھیں۔

سعید الظفر چغتائی
چغتائی ہاؤس، کبیر کالونی
سول لائنس علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

نذرِ غالب

آخرِ شب مجھ سے آخر وہ پری پیکر کُھلا
عقدۂ ترسیلِ خواہش تھا سرِ بستر کُھلا

ذہنِ خُفتہ میں کوئی در جب لبِ ساغر کُھلا
صبح نے دستک نہ دی اور منظرِ خاور کُھلا

کون ہوتا ہے حریفِ تختۂ دار و رسن
سر شماری کا حریمِ ناز میں دفتر کُھلا

ضاربِ سنگ آزما کے حوصلے کی داد دی
چشمِ چارہ ساز نے دیکھا جو زخمِ سر کُھلا

زیرِ لب اُس کا تبسم وہ درِ منہ نیم وا
جنبشِ لب کیا ہوئی گنجینۂ گوہر کھلا

صرصرِ نا آشنائے جہت نے زحمت نہ کی
ورنہ یہ بادِ مخالف دیکھتی شہپر کُھلا

دَشنۂ درمصلحت ہے فطرتِ پنہانِ فر
جُبّہ ودستار کے پردے میں ہے خنجر کھلا

حوصلہ پیما ہوئیں جب دشتِ جاں کی مشکلیں
دم بہ دم رخشِ قدم انداز کا جوہر کھلا

حشر میں روشن ہوا افسانۂ روزِ ازل
بانگِ میرِ عدل پر افعال کا مصدر کُھلا

☆☆☆

نذرِ غالبؔ

صرفِ شکوہ خوں نہیں فتراک میں نخچیر کا
پھر ملالت کون سا رُخ ہے تری تصویر کا

ذکر تھا موقوفِ پیہم باعثِ تعزیر کا
لب رہے خاموش تو منہ کھل گیا تحریر کا

زخم زارِ سینۂ صد چاک دیکھا چاہیے
خوں گرفتہ گو نہیں داماں کسی شمشیر کا

جذبۂ نا آشنائے عشق کی تعمیل کر
خونِ ناحق ہو تو ہو اِس قلبِ آفت گیر کا

کیا نگارستانِ ہستی تشنۂ تکمیل ہے
نقش، شکوہ سنج ہے ہر پیکرِ تصویر کا

وہ مری فریاد پر ہو مائلِ ایفا مگر
بے کمانِ نطقِ سوزاں کیا کروں اس تیر کا

میں بھی ہوں اُس حلقۂ دامِ جنوں سے منسلک
سلسلہ ہے پانو سے اس پانو کی زنجیر کا

آرزوئے نیم جاں ہے خُفتۂ دہلیزِ دل
خامشیِ جسم وجاں میں شور ہے تحسیر کا

وادیِ خوابِ سحر میں جادہ پیما گرد ہے
صبح تک دھندلا نہ جائے آئینہ تعبیر کا

☆☆☆

نذرِ غالبؔ

ترسیلِ خواہشات جو حد سے گزر گئی
اندھے کنوئیں کی آگ ندی میں اُتر گی

گھر سے اُڑی جو خاک سرِ رہ گزر گئی
صحرائے صحن اور بھی ویران کر گئی

دیوارِ احتیاط سے بہنے لگا لہو
پرچھائیں کس کی آئینے مجروح کر گئی

صدیوں کا انتشار فصیلوں میں قید تھا
دستک یہ کس نے دی کہ عمارت بکھر گئی

نیندیں سلگ رہی ہیں اجالوں کی چھاؤں میں
حیران ہوں وہ سردو سیہ شب کدھر گئی

کیا دشتِ گرد و باد ہوا شہرِ آرزو
یا عمر آندھیوں کے سفر میں گزر گئی

ہم بھی خیال و فکر کے محور پہ گھومتے
کیا کیجئے کہ وقت کی گردش ٹھہر گئی

☆☆☆

نذرِ میرؔ

خاموشی کی جھیل میں کس نے پتّھر مارا جانے ہے
بول سکوتِ شام یہ کس نے ہم کو پکارا جانے ہے

موج وتہہ وگرداب کی سازش دریا سارا جانے ہے
ہیں کتنے غرقاب سفینے خوب کنارا جانے ہے

پتھریلے الفاظ کی بارش آئینوں پر بار نہیں
لطفِ شکست وریخت یہ شیشہ پارہ پارہ جانے ہے

کشتیِ جاں میں ہجر کا دریا اُسنے کیسے پار کیا
چاند پہ کتنی بھاری تھی شب صبح کا تارہ جانے ہے

شام ڈھلے ریگِ ساحل پر کیا افسانہ لکھتی ہیں
حالِ دلِ امواجِ پریشاں صرف کنارہ جانے ہے

غرقِ انا بے تھاہ سمندر قابلِ یک جرعہ بھی نہیں
تشنہ لبی جانے کہ نہ جانے پانی کھارا جانے ہے

طرز و ادائے خانہ بدوشی ہم کو ہی منظور نہیں
ورنہ وراجِ عشق و وفا تو وہ بنجارہ جانے ہے

☆☆☆

نذرِ میر

نارسائی کا سفر ختم ہوا میرے بعد
کیوں ہو محجوب کوئی دستِ دعا میرے بعد

منکشف رازِ نہاں مجھ پہ ہوا میرے بعد
گنبدِ ذات کا دروازہ کھلا میرے بعد

نو بہ نو تازہ مفاہیم کا مظہر ہوگی
میرے الفاظ کی بوسیدہ قبا میرے بعد

آگیا زخم چھپا نے کا سلیقہ کِسکو
کون ہے بزم میں پھر نغمہ سرا میرے بعد

قصرِ احساس کی دہلیز پہ محسوس کریں
ہو جنہیں میرے نہ ہونے کا گلِا میرے بعد

رنج مٹنے کا نہیں رنج تو اس بات کا ہے
ہے کسے تابِ تمنائے وفا میرے بعد

میں چراغِ سحرِ دشتِ بلا تھا اب کیا
سر پٹختی پھرے آوارہ ہوا میرے بعد

بجھ کے رہ جائیں گے ہر طاق میں یادوں کے دیئے
کل جو رہ جائے گا دروازہ کھلا میرے بعد

جُبّۂ میرؔ سخن شاکیِ عالم ہوگا
دُکھ یتیمی کا سہیگی جوانا میرے بعد

فیضِ مختارؔ سے کچھ بات بنی ہے لیکن
کون باندھیگا علیگڑھ کی ہوا میرے بعد

☆☆☆

نذرِ آتش

سمندِ خواب وہاں چھوڑ کر روانہ ہوا
جہاں سراغِ سفر کوئی نقشِ پا نہ ہوا

عجیب آگ لگا کر کوئی روانہ ہوا
مرے مکان کو جلتے ہوئے زمانہ ہوا

میں تھا کہاں کا مصوّر کہ پوجتی دُنیا
بہت ہوا تو مرا گھر نگار خانہ ہوا

اُگاؤ درد کی فصلیں کہ زندگی جاگے
لہو کی فصل اُگاتے ہوئے زمانہ ہوا

پناہ لی تھی اندھیروں نے جسکے سائے میں
وہ سائبان بھی سورج کا آشیانہ ہوا

میں آئینہ ہوں ہر اک صاحبِ نظر کے لیے
مگر خود اپنے ہی چہرے سے آشنا نہ ہوا

بکھر گئی تھی سرِ راہ زندگی لیکن!
قدم رُکے تو مرا فرض تازیانہ ہوا

☆☆☆

اگر یہ آئنہ سچ بولنے سے ہے قاصر
تو میرے ہاتھ سے پتھر اُچھلنے والا ہے

☆

نذرِ آتش

میں نے کہا تھا کیا، تری دنیا نے جانا کیا
بدلی نہیں ہے اب بھی سرشتِ زمانہ کیا

تحریر آچکی تو یہاں اب ٹھکانا کیا
آخر چلیگا موت کے آگے بہانہ کیا

پھرتی ہے کیوں صدائے سَلاسِل مرے قریب
صحرا سے متصل ہے کوئی قید خانہ کیا

بے آگہیِ ذات سفر میں ہے زندگی
صحرائے بے خودی ہے ہمارا ٹھکانہ کیا

دانستہ چوٹ کھانے کی عادت نہیں مجھے
میں آزما چکاہوں تجھے آزمانہ کیا

ہے مقصدِ حیات مجھے مرگِ آرزو
جینے کا اور کوئی نہیں ہے بہانہ کیا

ہے جس کا ذکر باعثِ رسوائی اب تجھے
منسوبِ ذات ہے کوئی ایسا فسانہ کیا

راہیؔ غزل بہ لہجۂ آتش ہوئی یہ کیوں
حاصل ہے کچھ تجھے شرفِ غائبانہ کیا

☆☆☆

نذرِ انیسؔ

زمیں بہ دوش، سرِ آسماں جھکا کے چلے
حدِ جہاں سے پرے اک جہاں بسا کے چلے

تمام دشت ہوا بحرِ کوچۂ گریہ
وہ تشنہ گی جو سرِ کربلا بچھا کے چلے

نہ سر کو جھکنے دیا رن میں آخری دم تک
وہ سر فرازِ اجل تھے وہ سر کٹا کے چلے

برائے حق جو ہتھیلی پہ جان رکھتا ہو
چراغ لے کے وہی سامنے ہوا کے چلے

وہ حادثہ تھا کہ تم مجھ سے دور تھے لیکن
یہ سانحہ ہے کہ اتنے قریب آ کے چلے

سفر ہے رزم گہہِ کر بلا سے جنت کا
وہی چلے جو لہو میں وہاں نہا کے چلے

طرح طرح سے ہمیں اُس نے دست یاب کیا
قدم قدم پہ وفا کا فریب کھا کے چلے

غرورِ کفر کی دیوار ڈھنے والی تھی
اگر وہ تیر نہ ہاتھوں سے حرملا کے چلے

انیسؔ کس نے مقدر کی آزمائش کی
وہ تم ہی تھے جو نصیب اپنا آزما کے چلے

نذرِانیسؔ

کرو تلاش اُنہیں معرفت کے زینوں کو
جو آسماں کا پتا دے گئے زمینوں کو

شریکِ جام کروں اور اُن کمینوں کو
لگے جو ٹھیس تو لگ جائے آبگینوں کو

تمام عمر کی ہونے کو ہے شبِ ہجراں
اب انتظار میں گھڑیاں گنو مہینوں کو

بہ وصفِ ریشہ دوانی مجھے کریں ممنون
صلائے عام ہے خرمن کے خوشہ چینوں کو

زبانِ خشک سے جاری ہو چشمۂ زمزم
غرورِ تشنہ لبی دے وہ ہم نشینوں کو

قدیم عہد سے میرے سخن کا ہے رشتہ
مگر تراش رہا ہوں نئی زمینوں کو

امیرِ نقد و نظر میرا حوصلہ دیکھیں
کہاں سے ڈھونڈ کے لایا ہوں ان نگینوں کو

حسینؔ ابنِ علی ناخدائے کامل ہیں
وہی تو پار لگائیں گے ان سفینوں کو

ترے بیاں کی وہ ندرت ترے سخن کی ادا
انیسؔ لاؤں کہاں سے میں اُن قرینوں کو

☆☆☆

تیروکمانِ طنزوہجابے ہدف نہ رکھ
یعنی ہمارا ذکر ابھی بر طرف نہ رکھ

نازونیازِ عشق، یہاں کم شرف نہ رکھ
یہ شہرِ آزری ہے بُتوں سے شغف نہ رکھ

حاصل جو کربِ ذات کی بیچارگی کا ہے
صفحاتِ زندگی سے وہ قصّہ تلف نہ رکھ

کر عزم و آگہی سے شروعاتِ جنگِ نو
ضربِ شکست اورسرِ دست و کف نہ رکھ

ہنگامہ ہائے شر سے سرشتہ ہے زندگی
اس بے اماں کے ساتھ امیدِ غلَف نہ رکھ

تحریر وخط کی نوک پلک پھر دُرست کر
لے خوش خطی سے کام کہ مضموں پہ رف نہ رکھ

میں آشنائے نغمہ نے سازِ ذات ہوں
اے نغمہ سنج، مجھکو پسِ چنگ و دف نہ رکھ

لشکر میں خود سری کا بھی ہونا ہے امتحاں
اِمکانِ خلفشارِ خودی صف بہ صف نہ رکھ

مانا وہ لطفِ خاص نہیں زیبِ داستاں
ذکر اُسکا سانحات میں لیکن حذف نہ رکھ

سچ کے سوا میں کچھ نہ کہونگا یقین کر
مشکوک، چشم وفکر ونظر، اِس طرف نہ رکھ

☆☆☆

جنگ میں پروردگارِ شب کا کیا قصّا ہوا
لشکرِ شب صبح کی سرحد پہ کیوں پسپا ہوا

اک عجب سی پیاس موجوں میں صدا دیتی ہوئی
میں سمندر اپنی ہی دہلیز پر بکھرا ہوا

کچّی دیواریں صدا نوشی میں کتنی طاق تھیں
پتھروں میں چیخ کر دیکھا تو اندازہ ہوا

کیا صداؤں کو صلیبِ خامشی دے دی گئی
یا جنوں کے خواب کی تعبیر سنّاٹا ہوا

سبز ہاتھوں کی لکیریں زرد ماتھے کی شکن
اور کیا دیتا مری تقدیر کا لکھّا ہوا

رفتہ رفتہ موسموں کے رنگ یوں بکھرے کہ بس
ہے مرے اندر کوئی زندہ مگر ٹوٹا ہوا

پھر وہی سُنسان بستی پھر وہی ویراں کھنڈر
نیند جب ٹوٹی تو سمجھے خواب تھا دیکھا ہوا

دشت و صحرا کی خموشی پر زمیں حیران ہے
اے سکوتِ مستقل اُن زلزلوں کو کیا ہوا

☆☆☆

تلخی کا احساس کہاں اب زہر سلونا لگتا ہے
ناگ پھنی کا بستر ہمکو نرم بچھونا لگتا ہے

صرفِ سحروشام پگھلتا تپتا سونا لگتا ہے
سورج دھرتی کے ہاتھوں کا کوئی کھلونا لگتا ہے

میرا چہرہ تیری آنکھیں بے شک بازی ہار چکے
پھر بھی بساطِ عشق پہ اپنی ہار نہ ہونا لگتا ہے

سائے ہیں زرتاب برہنہ جسم گھٹائیں پھرتی ہیں
منظر افسوں ریز نظر کا جادو ٹونا لگتا ہے

تم ایسے احساس گزیدہ شہر میں کیسے جیتے ہو
یہاں کوئی گل پیش کرے تو خار چبھونا لگتا ہے

شاید اِس ویران نگر کے بانی تھے بے چہرہ لوگ
آئینہ بیزار کھنڈر کا کونا کونا لگتا ہے

اہلِ نظر محسوس کرینگے اُسکے بیاں کی گہرائی
قدآور الفاظ میں جو خود قد سے بونا لگتا ہے

ہم تنہا معتوبِ سفر اُس موڑ پہ آپہونچے کہ جہاں
اپنے کاندھوں پر خود اپنی ''ارتھی'' ڈھونا لگتا ہے

☆☆☆

تصویر کا ہر رنگ نظر میں ہے
کیا بات ترے دستِ ہنر میں ہے

سونا سا پگھلتا ہے رگ و پے میں
خورشیدِ ہوس کا سئہ سر میں ہے

نکلا ہوں تو کیا رختِ سفر باندھوں
جو کچھ ہے وہ سب راہ گزر میں ہے

اک رات ہے پھیلی ہوئی صدیوں پر
ہر لمحہ اندھیروں کے اثر میں ہے

پائی ہے سرابواں سے وراثت میں
وہ خاک جو دامانِ نظر میں ہے

پیشانیِ آئینہ پہ ہو ظاہر
جو زخم دلِ آئنہ گر میں ہے

کیا مہکیں تمنّاؤں کے گل بوٹے
ویرانیِ صحرا مرے گھر میں ہے

☆☆☆

تمام عمر سرابوں کی فصل کاٹی ہے
عجب زمین میں بویا تھا خواب دریا کا

بکھر رہا ہوں شکستہ خیال کی صورت
نہیں ہے لمحہ کوئی انتشار سے خالی

☆

لُوٹ کر پتّھر صدا دینے لگے کُہسار سے
ضربِ تیشہ پڑ گئی شاید مری گفتار سے

پھر کوئی اِس پار ہوگا پہلے جیسا حادثہ
پھر بلاوا موت کا آنے کو ہے اُس پار سے

گھاٹ کے پتّھر تھے ہم صدیوں کنارے پر رہے
رفتہ رفتہ کٹ گئے بہتی ندی کی دھار سے

جانے کب رہ جاؤں تنہا زلزلوں کے شہر میں
جانے کب تصویرِ کُہنہ گر پڑے دیوار سے

یک بہ یک آغوشِ مادر بن گیا میدانِ جنگ
لوریاں آنے لگیں تلوار کی جھنکار سے

دائروں کی قید سے نکلیگا سیدھا راستہ
کھینچنی ہونگی لکیریں وقت کے پَرکار سے

گھر سمندر ہے تجھے ہونا پڑے گا معتبر
بادباں کا کام لینا ہے اگر دستار سے

اے شہہِ اہلِ سخاوت کیوں مری تضحیک ہو
کوئی خالی ہاتھ کیوں لوٹے ترے دربار سے

☆☆☆

خواہش کشِ نیساں ہے نہ تعبیر طرف ہے
کیا خوابِ گراں قدر سرِ چشمِ صدف ہے

پر تول رہے ہیں ابھی خوش رنگ پرندے
کس رنگ میں نیرنگیِ میزانِ ہدف ہے

آہستہ روی شرط ہے مغرور ہواؤ
یہ دشت نہیں بارگہہِ خیر و شرف ہے

اصنام سری باعثِ تعزیر و خطا تھی
اب آئنہ سر ہوں تو جہاں سنگ بکف ہے

بے ساز و صدا انجمنِ شہرِ گماں میں
ہم نغمہ سرا ہیں کوئی بربط ہے نہ دف ہے

معدوم ہیں اس موڑ سے کچھ نقشِ کفِ پا
رودادِ سفر میں کوئی افسانہ تلف ہے

ہے جنگ کا ارماں تو لگا جان کی بازی
اب تیرے مرے بیچ نہ لشکر ہے نہ صف ہے

☆☆☆

جادہ پیما سفر گزار ہوا
ختم صدیوں کا انتظار ہوا

آنکھ دیکھے تو کچھ بیاں کروں
حادثہ کیا پسِ غبار ہوا

دوستی کی اساس تھی جس پر
دشمنوں میں وہی شمار ہوا

آسمانوں کے خواب ٹوٹ گئے
کیوں زمینوں کا انحصار ہوا

جس کے سائے سے دھوپ ڈرتی تھی
کیا وہ یادوں کا شاخسار ہوا

نور بکھرا پڑا ہے وادی میں
پیرہن شب کا تار تار ہوا

ایک تنکے سے جنگ ہار کے بھی
کیوں سمندر نہ شرم سار ہوا

خود کو پہچان تو لیا لیکن
آئینوں پر نہ اعتبار ہوا

صرف اک برگِ سبز تھا باقی
وہ بھی آزردۂ بہار ہوا

☆☆☆

ڈوبتے سورج کی برفیلی صدا کہلاؤ گے
دھوپ کی بیساکھیاں لے کر کہاں تک جاؤ گے

آتے جاتے موسموں کی زد میں ہے شاخِ بدن
تم بھی ان بوڑھے درختو کی طرح مرجھاؤ گے

ایک بھی عقرب تہہِ دامانِ دشتِ جاں نہیں
زہر سارِ آستیں کی جنگ کیا لڑپاؤ گے

شعر و نغمہ کوئی بندش نئے "آیام" دو
ورنہ عہدِ رفتگاں کا مرثیہ کہلاؤ گے

ان بکھرتی ٹوٹتی پرچھائیوں کے شہر میں
روشنی کے سائے کا قاتل کسے ٹھہراؤ گے

چاہتیں معصوم ہاتھوں کی جواں ہو جائیں گی
دے کے مٹّی کے کھلونے کیا انہیں بہلاؤ گے

کب کسی شے کو میسّر ہے عروجِ لازوال
آسمانوں کی بلندی سے زمیں پر آؤ گے

☆☆☆

یہ زرنگار شعاعوں کا جال ساخوں پر
سکھا رہی ہو سحر جیسے بال شاخوں پر

کبھی ہے دھول کبھی ہے گُلال شاخوں پر
وہی ہے رنگِ عروج و زوال شاخوں پر

درخت پی گئے ماہِ تمام کی کرنیں
پڑی ہے رات کی دلہن نڈھال شاخوں پر

یہ زخم زخم نہیں شاخسارِ نخلِ بدن
کھلے ہوئے ہیں گلِ لازوال شاخوں پر

نئے سرے سے تمنائے بارشِ گل کر
لپٹ گئی ہے جو گردِ ملال شاخوں پر

ترڑپنے دے انھیں دل کے اداس پنجرے میں
یہ زخم خوردہ پرندے نہ پال شاخوں پر

اب انتظار نہ کر تیز تر ہواؤں کا
لگی ہے بھوک تو پتّھرا چھال شاخوں پر

☆☆☆

جادۂ زیست میں تنویرِ سحر کر آنے تک
خواب بُنتے رہو تعبیر نظر آنے تک

لوٹ بھی آیا تو صدیوں کی تھکن لائے گا
صبح کا بھولا ہوا شام کو گھر آنے تک

زندگی پیاس سے مانوس نہ ہوجائے کہیں
وقت کے دشت میں اک لمحۂ تر آنے تک

ظلمتیں چھین نہ لیں ہم سے مقدّس چہرے
شمعِ مصلوب ترے شعلہ بسر آنے تک

ہم گناہوں کے پُجاری بھی تو بن سکتے ہیں
حاصلِ جذبۂ تقدیس نظر آنے تک

صبح کی دھوپ دھندلکوں میں بدل جاتی ہے
شاخِ اِفلاس پہ زرتاب ثمر آنے تک

چشمِ بے خواب کی صورت ہے سمندر میں صدف
ابرِ نیساں سے کوئی شعلۂ تر آنے تک

☆☆☆

خواب دیکھا چاہیئے بس خواب کی تعبیر کیا
قصدِ منزل ہوچکا پھر پانوٴ کی زنجیر کیا

سچ بتا آنے میں ٹھہرا باعثِ تاخیر کیا
وعدہ بیزاری نہیں تھی پانوٴ کی زنجیر کیا

لحظہ لحظہ امتحانِ ہستیِ موہوم ہے
سطحِ دریا پر کروگے تم بھی کچھ تحریر کیا

وہ تمہارے ہاتھ کی روشن لکیریں کیا ہوئیں
نا اُمیدی کے سفر میں کھوگئی تقدیر کیا

قصرِ ہستی کی عمارت زلزلوں کی زد میں ہے
بارِ جسم و سر سنبھالے عمر کا شہتیر کیا

فکر کی دیوار سے بہنے لگا کیسے لہو
ہوگئی مجروح نوکِ تیشۂ تدبیر کیا

ہے درخشاں منظرِ تاریکیِ ذہن و نظر
ظلمتِ شب میں ہے روش صبح کی تصویر کیا

جنگ لڑنے سے ہی پہلے صلح کا اعلان کیوں
ہے نیامِ مصلحت میں پھر تری شمشیر کیا

قارئینِ شعر کو اِدراک ہونا چاہیے
شعر گوئی میں روا ترسیل کیا تفسیر کیا

☆☆☆

ہے افسوں ریز پھر وہ چشمِ ساحر کچھ نہیں ہوگا
تمہیں اندازۂ رنگِ مناظر کچھ نہیں ہوگا

نظر لوٹیگی پھر آزردہ خاطر کچھ نہیں ہوگا
پسِ منظر ہے سب پیشِ مناظر کچھ نہیں ہوگا

سحر بیدار ہونے تک نقیبِ آخرِ شب ہوں
بجز دودآشنائے بے نوا پھر کچھ نہیں ہوگا

دریچوں میں لگے پردوں کے اندر جھانک کر دیکھو
درودیوار کی رنگت سے ظاہر کچھ نہیں ہوگا

یہاں بے سود موسم خواہشوں کے بیج بوتے ہیں
زمینِ دل ہے بیزارِ عناصر کچھ نہیں ہوگا

لہو زخمی پرندوں کو صدا دیتا تو ہے لیکن
پرندے ہیں ابھی پرواز قاصر کچھ نہیں ہوگا

دیارِ بود و امکاں تک مسلسل آزمائش ہے
کہیں پھر امتحانِ بعد و آخر کچھ نہیں ہوگا

نہ اُتر و ڈرَی کے آخری الفاظ کی تہہ میں
سراغِ قتل در تحریر آخر کچھ نہیں ہوگا

☆☆☆

غیر ممکن کہ کسی موڑ پہ آلو مجھ کو
دیر سے ڈھونڈنے نکلے ہو غزالو مجھ کو

گُھٹ کے مرجاؤں گا للہ بچا لو مجھ کو
میں سمندر ہوں سرابوں سے نکالو مجھ کو

کیا خبر کل میں تمہارے لیے عیسیٰ نہ رہوں
آج پلکوں کی صلیبوں پہ سجالو مجھ کو

پھر زمین چوس رہی ہے مِرے تلووں سے لہو
تم جو ارجُنؔ ہو تو تیروں پہ اٹھالو مجھ کو

ہاتھ بہکا جو تمہارا تو بکھر جاؤں گا
پتھّروں کی یہ زمیں ہے نہ اُچھا لو مجھ کو

اجنبی بھیڑ میں گُم ہونے لگی تھیں آنکھیں
تم کہاں مل گئے اے میرے خیالوں مجھ کو

تم ہر اک لفظ کا مفہوم بدل سکتے ہیں
کاش بوسیدہ کتابوں سے چرالو مجھ کو

☆☆☆

چشمۂ خوں مری رگ رگ سے اُبلنا چاہے
توڑ کر جسم کی دیوار نکلنا چاہے

میں جواک اشکِ ندامت کی وضاحت چاہوں
اک سمندر مری تحریرمیں ڈھلنا چاہے

روشنی مانگ رہا ہوں میں اسی سائے سے
جو اندھیرے میں مرے ساتھ نہ چلنا چاہے

زندگی بن کے بکھر جائے مری راہوں میں
دردبن کر جو مری روح میں پلنا چاہے

لوگ پھر جسم کے بنباس سے لوٹ آئے ہیں
پھر رگ وپے میں جمی برف پگھلنا چاہے

کون آباد ہے اس جسم کے ویرانے میں
شمع بن کر جو سرِ شام ہی جلنا چاہے

تنگ ہوں گرمیِ جذبات کی لاچاری پر
کیا کرے آگ جو پتھر نہ پگھلنا چاہے

☆☆☆

ہر ایک گھونٹ مجھے شِو کا روپ دیتا تھا
میں حادثات کا سم اس لیے اُگل نہ سکا

نہ تنگ آؤ سمندر کھنگالنے والو
کہ وِش کے بعد ہی امرت نکلنے والا ہے

☆

کس بلندی پہ ہوا نقش اُجاگر میرا
اپنے پیروں کی طرف جھکنے لگا سر میر

اب ہے تاحدِّ نظر سلسلۂ موجِ سراب
منتظر تھا کبھی صحرا میں سمندر میرا

میں جو بنیادِ صنم خانۂ ہستی ہوں تو پھر
بے خبر کیوں ہے مری ذات سے آزر میرا

کوئی تو ہوتا جو ٹکرا کے بکھرتا مجھ سے
سب سے ٹکرا کے بکھرنا ہے مقدر میرا

تھا بجز میرے غمِ شعلہ فشانی کس کو
آگ جس گھر کو لگی نکلا وہی گھر میرا

نبضِ غم خوفِ ہلاکت سے رکی جاتی ہے
شہ رگِ گردشِ دوراں پہ ہے خنجر میرا

فتح کے بعد جہاں ہوتا ہے احساسِ شکست
پھر اسی جنگ کے میداں میں ہے لشکر میرا

مستقل کب سے تعاقب میں ہے اک پیاسی ندی
منتظر دشت میں ہے کب سے سمندر میرا

☆☆☆

خوں گرفتہ ہو تو خنجر کا بدن دُکھتا ہے
پنجۂ خیر میں ہی شر کا بدن دُکھتا ہے

پیکرِ نیم شکستہ ہوں کرو تیشہ زنی
بارشِ گل سے پہ پتّھر کا بدن دُکھتا ہے

کون ہے تجھ سا جو بانٹے مری دن بھر کی تھکن
مضمحل رات ہے بستر کا بدن دُکھتا ہے

مستقل شورشِ طوفاں سے رگیں ٹوٹتی ہیں
ضبطِ پیہم سے سمندر کا بدن دُکھتا ہے

زخم خوردہ درودیوار کی حالت ہے عجب
صرف آہٹ سے مرے گھر کا بدن دُکھتا ہے

صنعتِ سنگ میں ہے دردِ صداقت کتنا
بُت کوئی ٹوٹے تو آزر کا بدن دُکھتا ہے

قیمتِ جاں کی توقع کفِ قاتل سے کہاں
خوں بہا یہ ہے کہ خنجر کا بدن دُکھتا ہے

درد موجوں کی رفاقت کا بڑا ہے شاید
قربِ ساحل سے شناور کا بدن دُکھتا ہے

☆☆☆

بربطِ سکوت میں نغمگی عجیب تھی
قہقہوں کے شہر کی خامشی عجیب تھی

سرورق پہ دائرے اُس کے بعد کچھ کراس
آخری ورق سیہ ڈائری عجیب تھی

جیسے دھوپ کی تھکن جیسے سائے کی جلن
اس عظیم شخص کی زندگی عجیب تھی

ظلمتوں کے گاؤں میں دیپ جھلملا اٹھے
روشنی کے سائے کی موت بھی عجیب تھی

اُس کے ہر سوال کے سو جواب تھے مگر
مجرمانِ وقت کی خامشی عجیب تھی

زر نگار آسماں ڈوبتے چلے گئے
مفلسی کے دشت میں تیرگی عجیب تھی

چور چور ہوگئے بے شمار آئینے
پتھروں سے پھوٹتی روشنی عجیب تھی

☆☆☆

کہسارِ تغافل کو صدا کاٹ رہی ہے
حیراں ہوں کہ پتّھر کو ہوا کاٹ رہی ہے

پیشانیِ ساحل پہ کوئی نام نہ ابھرے
ہر موج سمندر کا لکھا کاٹ رہی ہے

الفاظ کی دھرتی پہ ہوں مفہوم گزیدہ
اب جسم پہ کاغذ کی قبا کاٹ رہی ہے

ہر روح پسِ پردۂ ترتیبِ عناصر
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی ہے

مجبوب ہیں مغرور درختوں کی قطاریں
ہر شاخ کو شمشیرِ انا کاٹ رہی ہے

فن کار کا خوں دامنِ تخلیق پہ گویا
تصویر مصوّر کا گلا کاٹ رہی ہے

در قصرِ مفاہیم کا ٹوٹے کہ نہ ٹوٹے
دیوار، مری فکرِ رسا کاٹ رہی ہے

☆☆☆

❀

کشتیاں ڈوب رہی ہیں کوئی ساحل لاؤ
اپنی آنکھیں مری آنکھوں کے مقابل لاؤ

ساربانِ سفرِ جادۂ منزل لاؤ
لیلیِ جاں کے لیے ناقہ و محمل لاؤ

ایک آواز اُبھرتی ہے پسِ منظرِ خوں
اے اجالو مری تصویر کا قاتل لاؤ

پھول کاغذ کے ہیں اب کانچ کے گُلدانوں میں
تم بھی بازار سے پتّھر کے عنادل لاؤ

مڑ کے دیکھو گے تو پتھر سے بدل جاؤ گے
اب تصوّر میں نہ بھولی ہوئی محفل لاؤ

روشنی ہے مری ویران نگاہی کا سبب
اب نہ چہرہ کوئی سورج کے مماثل لاؤ

قصرِ مرمر میں سلگتی ہوئی روحوں کے لیے
اندھیو کچے مکانوں سے کبھی گل لاؤ

خودشناسی کا جنوں ہے تو کبھی صاحبِ من
آئینہ بھی کوئی چہرے کے مقابل لاؤ

☆☆☆

عجیب سلسلۂ پیچ و خم ہیں دیواریں
کہ جیسے حدِّ وجود و عدم ہیں دیواریں

اُداس کھڑکیاں نیلاہٹیں اُگلتی ہیں
پٹے ہوئے تری یادوں کا سم ہیں دیواریں

حصارِ ہستیِ موہوم توڑ دیں لیکن
ہماری راہ میں قول و قسم ہیں دیواریں

یہ سنگ و خشت بھی احساس سے نہیں عاری
وہ دیکھو بارِ حقائق سے خم ہیں دیواریں

اٹھو کہ منزلیں آواز دے رہی ہیں تمہیں
بڑھو کہ صرف نظر کا بھرم ہیں دیواریں

میں ممکنات کی حد سے گزرنے والا ہوں
کوئی پہاڑ اُگاؤ کہ کم ہیں دیواریں

قتیلِ خنجرِ باطل نہ جانے کون ہوا
کہ آج خونِ صداقت سے نم ہیں دیواریں

ہمارے سائے میں سورج پنا لیتا ہے
شعاعِ کرب نہ ٹکرا کہ ہم ہیں دیواریں

☆☆☆

بجھے بجھے سے شرارے ہیں زرد شاخوں پر
سجا گیا ہے کوئی اپنا درد شاخوں پر

سفیرِ شب کا کوئی اشک ڈھونڈتے ہونگے
ہوا کے جلتے ہوئے ہونٹ سرد شاخوں پر

عیاں ہے رنگِ تغزّل گلوں کے چہروں سے
بیاضِ رنگ نہیں فرد فرد شاخوں پر

لپیٹے نور کی چادر میں درد کے سائے
بھٹک رہا ہے کوئی شب نورد شاخوں پر

ہوا کی گود میں موجِ سراب بھی ہوگی
گرینگے پھول تو ٹھہر یگی گرد شاخوں پر

پیئے ہوئے ہیں شجر انتہائے کرب کا سم
کہ ہے نمودِ گُلِ لاجورد شاخوں پر

عروسِ بوئے بہاراں نے کیا شرارت کی
کہ ہیں سفیرِ صبا خود نبرد شاخوں پر

وہ اک اڑان میں شہرت کا آسماں ٹھہرا
سمٹ کے رہ گئے باتوں کے مرد شاخوں پر

☆☆☆

نگاہ ڈور لگے آسماں پتنگ لگے
مجھے یہ عالمِ امکاں بہت ہی تنگ لگے

گلی کا شور مکانوں میں لے چلو یارو
پیامِ صلح بہ اعلانِ سرد جنگ لگے

بہ فیضِ شکل و شباہت وہ آدمی ہے مگر
شکار سامنے آجائے تو نہنگ لگے

لباسِ رنگ سے جھانکے جو مرمریں سا بدن
حصارِ سنگ سے باہر شرارِ سنگ لگے

وہ چپ رہے تو لگے آبشارِ خاموشی
جو ہنس پڑے تو اُجالوں کا جل ترنگ لگے

نہاں زمیں کہ تہوں میں ہے زلزلوں کی دھمک
ہر اک درار دھڑکتی ہوئی سُرنگ لگے

بہت ہوا کہ اٹھا کر اِسے نیام میں رکھ
پڑے پڑے نہ کہیں آستیں میں زنگ لگے

☆☆☆

کچھ اور طرزِ تیشہ نوائی کو دھار دے
کہسارِ بے حسی میں شرارے اُتار دے

آنکھوں کو اعتبار کی حد سے گزار دے
خوابوں کو ننگے پاؤں زمیں پر اُتار دے

بے اعتباریوں کی قبائیں اتار پھینک
پھر اعتبارِ ذات بہر اعتبار دے

کچھ بد نظر جو گشتۂ شہرِ خیال ہیں
نازک عمارتوں کو فصیلِ غبار دے

کیوں ہے قلم خموش کہ سونی ہیں فائلیں
کاغذ کی اس زمیں کو نئے حرف زار دے

کیا باعثِ سکوتِ مسلسل ہے خود بتا
یا پھر فصیلِ خامشی کو اشتہار دے

فکرِ رسا کو رنگ شناسِ بہار کر
شاخِ نہالِ فن کو نئے برگ دیار دے

☆☆☆

نہ میں زمین پہ ٹھہرا نہ آب پر ٹھہرا
عدم وجود تھا موجِ سراب پر ٹھہرا

ہوا نے دوش سے جھٹکا تو آب پر ٹھہرا
میں کچھ بھنور میں گرا کچھ حباب پر ٹھہرا

میں لفظِ خام ہوں کوئی کہ ترجمانِ غزل
یہ فیصلہ مری تازہ کتاب پر ٹھہرا

زمیں سے جذب یہ پگھلی سی نکہتیں نہ ہوئیں
عروسِ شب کا پسینہ گُلاب پر ٹھہرا

غم و نشاط کا کتنا حسین سنگم ہے
کہ تارہ آنکھ سے ٹوٹا شراب پر ٹھہرا

روپہلی جھیل کی موجوں میں اضطراب سا ہے
قدم یہ کس کا سنہرے سراب پر ٹھہرا

خطا جو مجھ سے ہوئی ہے تو کوئی وجہِ خطا
چلو یہ فیصلہ عالی جناب پر ٹھہرا

سفر شروع غزل سے ہوا تھا لفظوں کا
قلم چلا تو رباعی کے باب پر ٹھہرا

☆☆☆

کچھ تو سچّائی کے شہکار نظر میں آتے
کاس ہم لوگ نہ خوابوں کے اثر میں آتے

ہم نے اس خوف سے خاکوں کو مکمل نہ کیا
شام کے رنگ بھی تصویرِ سحر میں آتے

جبکہ ہر روزنِ دیوار نمکداں ٹھہرا
کیسے مجروح اُجالے مرے گھر میں آتے

سوئے پنگھٹ پہ جمی برف پگھل سکتی تھی
پیاسے سورج تو کبھی میرے نگر میں آتے

اجنبیّت کے دریچوں میں کھلی تھیں آنکھیں
کس کے سائے مرے خوابوں کے کھنڈر میں آتے

شاملِ حال رہی مصلحتِ شیشہ گری
ورنہ پتھر ہی زدِ فتنہ و شر میں آتے

ہم بگولوں کی طرح بادیہ پیما تھے مگر
اِذن ہوتا تو تری راہ گزر میں آتے

☆☆☆

ہر اک محاذ پہ اپنی نظیر ہونا تھا
تجھے تو جنگ میں ارجُن کا تیر ہونا تھا

زمانے بھر کے خزانے مری تلاش میں تھے
مگر مجھے ترے در کا فقیر ہونا تھا

زمیں نے راہ میں کانٹے بچھا دئے ورنہ
یہ آسماں بھی سیاست پذیر ہونا تھا

منافقت کے اُجالے تجھے پکارتے تھے
بہ احتیاطِ نظر جادہ گیر ہونا تھا

میں جانتا تھا مجھے حفظِ ماتقدم میں
محاذِ جنگ سے پہلے اسیر ہونا تھا

یہ لوگ کوزے میں دریا بہت اُتارتے تھے
کبھی تو حادثۂ ناگزیر ہونا تھا

وہ شخص کیوں صفِ دشمن میں ہوگیا شامل
جو اس سفر میں مرادست گیر ہونا تھا

برائے نظمِ جہاں کاروبارِ ہستی میں
کسی کو شاہ کسی کو فقیر ہونا تھا

غزل کے نام پہ کیچڑ اُسے اُچھالنا تھی
اُسے نہ ہونا تھا غالبؔ نہ میرؔ ہونا تھا

☆☆☆

گاؤں سے گزریگا اور مٹّی کے گھر لے جائے گا
ایک دن دریا سبھی دیوارو در لے جائے گا

گھر کی تنہائی میں یوں محسوس ہوتا ہے مجھے
جیسے کوئی مجھکو مجھ سے چھین کر لے جائے گا

کون دیگا اُس کو میری تہہ نشینی کا پتا
کون میرے ڈوب جانے کی خبر لے جائے گا

آئینے ویراں نگاہی کا سبب بن جائیں گے
خود پسندی کا جنوں تابِ نظر لے جائے گا

صبح کے سینے سے پھوٹیگی شاعِ مہرِ نو
سب اندھیرے رات کے دستِ سحر لے جائے گا

جذبۂ جہدِ مسلسل ہے بنائے زندگی
یہ گیا تو سارا جینے کا ہُنر لے جائے گا

تشنہ گانِ دشتِ امکاں گم رہی کی زد میں ہیں
جانے کس جانب سرابوں کا سفر لے جائے گا

☆☆☆

پائے رقّاصۂ خواہش کے جو گھنگرو جاگے
دشت و کہسار میں سوئے ہوئے سادھو جاگے

رات انگڑائی لے سانسوں میں اگر تو جاگے
میرے کمرے میں ترے جسم کی خوشبو جاگے

کھو دیا کس نے ہوس ناک اندھیروں کا بھرم
فاحشہ شب کی سیہ کوکھ میں جگنو جاگے

نخلِ الفاظ میں ترسیل کی کونپل پھوٹی
دشتِ ابلاغ میں اب کوئی سخن جو جاگے

خانۂ دشت نما کس کی کمیں گاہ بنا
کیسی آہٹ تھی کہ ہم صورتِ آہو جاگے

پیاسی دھرتی پہ ترس کھائے نہ کوئی بادل
اب نہ ذرّوں میں کبھی دھوپ کی خوشبو جاگے

روئے مہتاب سیہ رات کی زد میں آجائے
سوتے سوتے جو ترا حلقۂ گیسو جاگے

حسنِ عجز اپنی جگہ شانِ نیاز اپنی جگہ
جنگ لازم ہے تو پھر غیرتِ بازو جاگے

☆☆☆

تجربوں کی دھوپ سائے سے بدل جانے بھی دے
اپنی پیشانی پہ کڑوا نیم اُگ آنے بھی دے

اے خدا تیرہ ضمیروں کو عطا کر روشنی
اور کچھ روشن ضمیروں کو سیہ خانے بھی دے

دیر ہے جشنِ طرب میں نغمہ سنجِ صبحِ نو
آخرِ شب تیرگی کا مرثیہ گانے بھی دے

شہر کی گنجان سڑکیں ہیں سکوں نا آشنا
اے خدا آبادیوں کے بیچ ویرانے بھی دے

میرے ہاتھوں کی لکیریں دے چکی ہیں فیصلہ
مجھکو ناکردہ گناہوں کی سزا پانے بھی دے

چھورہی ہیں آسماں کوروح کی گہرائیاں
یہ فصیلِ قلعۂ جاں کیا ہے ڈھہ جانے بھی دے

دشت و دریا کو مسلسل بارشیں درکار ہیں
پھر کوئی ابرِ رواں آندھی سے ٹکرانے بھی دے

لوگ اپنے قد میں شامل کر چکے بیساکھیاں
میری آنکھوں کو بقدر ظرف پیمانے بھی دے

☆☆☆

کہسار کے سینے میں نہاں جوئے شرر ہے
پتھریلی چٹانو کے بکھر جانے کا ڈر ہے

ہے ختم سفر اب نہ کوئی شور نہ شر ہے
اس موڑ سے آگے کوئی دیوار نہ در ہے

ارزانیِ بازار سے خوابوں کی دُکاں تک
خود دستِ ہُنر دستِ تہہِ سنگِ ہنر ہے

معدوم ہیں سب نقش ونگارِ سر و چہرہ
اوہام کی آندھی میں بگولوں کا سفر ہے

تحقیقِ جہاں ہے پسِ تحقیقِ جہاں اور
درکار نظر کو ابھی صدیوں کا سفر ہے

وابستۂ انجامِ بہاراں ہے خزاں بھی
منظر کشِ صحرا بھی ہراک شاخِ شجر ہے

اک رات کے مہماں ہیں یہ آوارہ پرندے ہے
ان خانہ بدوشوں کا کوئی گھاٹ نہ گھر ہے

ماضی کے حوالے سے کئی نام ہیں روشن
تجریدِ تعلق سرِ تحریرِ خبر ہے

☆☆☆

سمجھ سکا نہ کوئی رازِ ہائے خاموشی
مجھے صلیب ملی بر بنائے خاموشی

کہاں کا ظرف کہ جب دورِ خود نمائی ہے
اُتار پھینک سمندر قبائے خاموشی

خروشِ خواہشِ ہستی لہوں میں ڈوب گیا
رگوں میں تیر رہی ہے نوائے خاموشی

اُچھالیئے نہ ہوا میں صداؤں کے خنجر
کہ چاک ہونہ سکیگی رِدائے خاموشی

میں آگہی کی کڑی دھوپ سہہ نہ پاؤں گا
شعورِ ذات نہ دے انتہائے خاموشی

اُٹھالیا ہے جو خنجر تو سوچتا کیا ہے
مری زبان قلم کر برائے خاموشی

بچھا گیا ہے، کوئی کرب، گہرا سنّاٹا
وگرنہ دشت نہ تھا آشنا ئے خاموشی

☆☆☆

دینا ہے تو یوں تلخیِ اساس کا سم دے
تاثیر سِوا کر ذرا مقدار میں کم دے

ان خشک پہاڑوں میں نہ جھرنوں کو جنم دے
اے ننگِ ہوس تیشۂ تدبیر کو خم دے

اے رخنہ گرِ راہ سرِ جادۂ منزل
پیروں کو مرے زخم بہ اندازۂ رم دے

اس دشت کی بوندوں سے کہاں پیاس بجھے گی
سیرابیِ دریا بھی کبھی ابرِ کرم دے

کیا سمتِ سفر ہے سرِ صحرائے تجسّس
گم گشتۂ منزل کا پتا نقشِ قدم دے

بیزارِ نزاکت ہے دیارِ گل وشیشہ
شیشے کے عنادل نہ دے پتھر کے صنم دے

اک عمر سے میں نقش بہ قرطاسِ غزل ہوں
اب تو کوئی پہچان مجھے نوکِ قلم دے

☆☆☆

وہ یقیں بن کر پسِ وہم و گماں روشن ہوا
میں بُجھا کس سمت تھا آکر کہاں روشن ہوا

دیدکیا کرتے کہ تابِ ذوقِ نظّارہ گئی
اک عجب منظر زمیں تا آسماں روشن ہوا

فکر کی دہلیز پر برسے جوسنگِ آگہی
ذہنِ خُفتہ امتحاں در امتحاں روشن ہوا

آندھیوں کی یورشوں کا پیش خیمہ تونہیں
آخرِ شب کیوں چراغِ نیم جاں روشن ہوا

بستۂ اسرارِ معنی تھا فسوں کارِ سخن
جنبشِ لب کیاہوئی اک آسماں روشن ہوا

بس کہ اِن بیمار شمعوں کی لَویں کردو قلم
اِن سے کوئی گھر نہ کوئی سائباں روشن ہوا

تیرگیِ شب نے کیا جادو کیا پچھلے پہر
دشتِ جاں تک جگنوؤں کا کارواں روشن ہوا

شب گزیدہ سے اجالے زرد کرنوں میں لئے
جادہ پیمائے سحر پھر سرگراں روشن ہوا

☆☆☆

سونا پیتل رول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی
لوگو سب کو تول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

میری خوشبو تیرے تن میں بس جائے گی رفتہ رفتہ
خود کو تجھ میں گھول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

پلکوں کی میزان سنبھالے یادوں کی دوکان پہ تنہا
درد کی دولت تول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

میں نے لوہے کے کنگن کو سونے جیسا روپ دیا ہے
خود سونے کا جھول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

تم جو ملو تو اپنی بکھری ہستی کو میں یک جا کرلوں
کب سے پریشاں ڈول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

مجھ جیسے کتنے ہی سوتی ٹوٹ کے سستے بھاؤ بکے ہیں
پھر بھی میں انمول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

دنیا کے بازار میں بیشک جھوٹ کا سِکّہ چلتا ہوگا
لیکن میں سچ بول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتّی رتّی

☆☆☆

آتش افشاں خواب ہیں پلکیں بھگونا چاہیے
ریگزارِ شب میں اب دریا ڈبونا چاہیے

سروری میں حوصلہ ہرگز نہ کھونا چاہیے
کیا کسی مختار کو مجبور ہونا چاہیے

بند کمرے میں نہ یوں تکیہ بھگونا چاہیے
رات کی بنجر زمیں خواب بونا چاہیے

اب امیرِ شہر کو چاندی نہ سونا چاہیے
شب گزاری کے لیے لیکن! کھلونا چاہیے

مصلحت سازی میں عکس ورنگ زخمی ہیں تو پھر
پتّھروں کو آئنہ بیزار ہونا چاہیے

کوئی تو دشتِ سفر میں رخنہ اندازی کرے
کوئی تو اس راہ کی دیوار ہونا چاہئے

کیوں خجل دستِ جراحت ہو مرے ہوتے ہوئے
مندمل زخموں میں پھر نشتر چبھونا چاہئے

اور بھی مہماں تمہارے دل میں ہیں لیکن مجھے
مجھ سے ہے مخصوص جو بس اک وہ کونا چاہئے

شام سے اخبار کو کچھ سُرخیاں درکار ہیں
جادہ پیمائے سحر کا قتل ہونا چاہئے

☆☆☆

اے سنگ زاد کب سے تری دیکھ بھال میں
آئینے لخت لخت ہیں دشتِ خیال میں

کیسی طلب نہاں رہی دستِ سوال میں
میں خو ہی کھوگیا کہیں گردِ ملال میں

وہ ساعتیں جو نقد ہیں عرفانِ ذات کا
اُنکا شمار کیسے کروں ماہ و سال میں

آئینے حق نوائی کی جرات کریں مگر
مابینِ خشت و سنگ رہیں اعتدال میں

بے وجہ اعتبار کو لغزش نہیں ہوئی
کچھ وہم کا بھی رنگ تھا شامل مزال میں

خوش فہمیوں کی دھوپ دغادے گئی تو کیا
شب بھر کا فاصلہ ہے عروج وزوال میں

تاریکیوں کو اِذن بغاوت ہوا تو کیا
محفوظ گھر کا چاند ہے مکڑی کے جال میں

تم خود قِمار خانۂ ہستی کے تھے خدا
پھر کیسے مات ہوگئی پہلی ہی چال میں

☆☆☆

باب آخر میں ہے کچھ تشنۂ تحریر ابھی
خامہ فرسا ہے مرا کاتبِ تقدیر ابھی

ناوک انداز ہے وہ قاتلِ بے پیرا ابھی
ٹک نہیں چین سے سینے میں دلِ میرؔ ابھی

جسم واعصاب کی بوسیدہ فصیلوں پہ نہ جا
عزم پر بار نہیں عمر کا شہتیر ابھی

دل کی دھڑکن نے سماعت کا بھرم توڑ دیا
ورنہ تھی مجھ سے مخاطب تری تصویر ابھی

مہرباں ہو کے مجھے تشنۂ تکمیل نہ رکھ
کچھ نکھر نے دے غم و درد کی تصویر ابھی

رفتہ رفتہ ترے الفاظ کا در کھلتا ہے
انکشاف اور کریگی تری تحریر ابھی

آتشِ جوشِ جنوں صرفِ نظر کرو ورنہ
راکھ ہو جائے گی یہ پاؤں کی زنجیر ابھی

گھر کی دہلیز پہ ہیں جامد و ساکت آنکھیں
اور ہے راہ میں روشن وہی تاخیر ابھی

نغمہ زن مطربِ دل ہے تو زرا ساتھ نبھا
کیفِ غم اور بڑھا سازِ صدا گیر ابھی

☆☆☆

مجھے نہ حاجتِ دنیا نہ خواہشِ محشر
بلا سے اب نہ چلے کاروبارِ شام و سحر

سفر سے روک رہا ہے غرورِ تشنہ لبی
نگاہ دیکھ رہی ہے سراب کا منظر

تمام عمر کوئی مہرباں نہیں رہتا
تو اس قدر بھی مرے غم پہ اعتبار نہ کر

یہ کارزارِ بدن سادھوؤں کا ہے ڈیرا
یہاں نہ ٹھہرا کریں خواہشات کے لشکر

وہ جس سے آتی ہے خوشبو وفا پرستی کی
اس آستیں سے ہی نکلیگا دیکھنا خنجر

چھپا کے زخم وہ کرتا رہا مسیحائی
مگر کسی نے کہاں پوچھا حالِ چارہ گر

صنم کدے سے ابھرتی ہے دھڑکنوں کی صدا
کہ پتھروں کی حفاظت میں ہے دلِ آزر

بیاضِ شعر اگر اُسکی اک صحیفہ ہے
تو کیوں نہ مان لیں اُسکو غزل کا پیغمبر

☆☆☆

مستقل پاؤں میں سفر رکھنا
لیکن انجام پر نظر رکھنا

شانۂ آسماں پہ سر رکھنا
اپنا خنجر لہو میں تر رکھنا

تم جو کڑوا مزاج رکھتے ہو
اپنا لہجہ بھی معتبر رکھنا

لفظ کھوٹے کھرے بھی ہوتے ہیں
انکے مفہوم پر نظر رکھنا

گھر میں سورج اُترتے رہتے ہیں
کچی مٹی کے بام و در رکھنا

ہونہ جائیں کہیں یہ ہاتھ قلم
خود کو نادان و بے ہنر رکھنا

کل اندھیروں میں کام آئینگی
اپنی کرنیں سنبھال کر رکھنا

پی گیا وہ خوابِ خط آخر
کیا ضروری تھا نامہ بر رکھنا

☆☆☆

اجنبی بن کر نظر میں شکل پہچانی رہے
چاہتا ہوں عمر بھر آنکھوں کو حیرانی رہے

صبطِ پیہم وادیِ دل سے کوئی چشمہ نکال
خشک آنکھوں میں بیک لمحہ کبھی پانی رہے

میں کہ دانہ ہو کے اپنے آپ سے بیزار ہوں
میرے بچوں میں خدا تا عمر نادانی رہے

جو گئے ماضی و مستقبل کو دے کر تیرگی
اُن اُجالوں کے سفر میں تیرہ ویرانی رہے

مطمئن ہونا بھی ہے توہین اہلِ عزم کی
دشت میں آندھی چلے دریا میں طغیانی رہے

نزدِ قلب وجاں رہیں اُس عہد کے سائے کبھی
دشت وصحرا کی فضا کچھ دیر عمرانی رہے

رات بھر دہکا کریں وادی میں جسموں کے الاو
شرط ہے کہسار کا موسم بھی بر فا نی رہے

میں تری گڑیا چُراؤں تو کبھی پتھر اچھال
عہدِ پیری میں طبیعت کچھ تو بچکانی رہے

☆☆☆

گھر گھر اُڑا کے خاک ہراک آرزو گئی
یعنی صدائے سبز قدم کو بہ کو گئی

پرچھائیں اسکی آج مراجسم چھوگئی
اے شمع اِحتیاط تری آبروگی

ہے زندگی سفر میں مگر گُم ہیں راستے
ویرانیِ نگاہ کہاں سمت و سو گی

آنکھوں میں دم ہے ہاتھ کو جنش بھی ہے مگر
یہ کیا ہوا کہ خواہشِ جام وسبو گئی

غم ہائے زندگی سے بچھڑنے کے باوجود
تصویرِ کائنات نظر سے نہ تو گئی

اب دشتِ ناشناس میں اپنی تلاش ہے
اچھا ہوا نظر سے ہراک جستجو گئی

حاصل ہے تو مجھے تو خوشی ہے نہ کوئی غم
دل کیا کرے کہ دل سے تری آرزو گئی

عطّارِ شہر چھوڑ سبھوں کو چلا گیا
پراُسکی یاد میرؔ کے دل سے کبھو گئی

☆☆☆

پرندے لوٹ کے جب گھر کو جانے لگتے ہیں
ہمیں بھی یاد، دار و بام آنے لگتے ہیں

اسے جب آئینہ دیتا ہے چہرہ بیزاری
تو اشک آنکھ سے کاجل بہانے لگتے ہیں

فصیلِ سرحدِ ماضی دھڑکنے لگتی ہے
جو خواب نیند کا در کھٹکھٹانے لگتے ہیں

حباب دھوپ کی بارش میں پھوٹتے بنتے
ثباتِ ذات کا مطلب بتانے لگتے ہیں

سرِ محاذ ترے آتے ہی حریف مرے
یہ میرے ہاتھ مجھے آزمانے لگتے ہیں

ترے خیال کی محفل جو سجنے لگتی ہے
قریبِ حال گزشتہ زمانے لگتے ہیں

جو آسمان کو ضد ہے تو کم نہیں ہم بھی
کہ بعدِ برق نئے گھر بنانے لگتے ہیں

جو سُنتے ہیں کہ ترے شہر میں دسہرا ہے
ہم اپنے گھر میں دِوالی سجانے لگتے ہیں

سُنی سُنائی سی ہر اک کہانی لگتی ہے
نئے ہیں لفظ معانی پرانے لگتے ہیں

☆☆☆

سلگتی ریت پہ آنکھیں نچوڑتے کیوں ہو
سمندروں کو سرابوں سے جوڑتے کیوں ہو

زمیں کی گود میں کچھ اور بھی تو سورج ہیں
نظر کا دائرہ اِتنا سکوڑتے کیوں ہو

گلی کی دھوپ سے پتھر بھی موم ہوتے ہیں
کھلا تم اپنے دریچوں کو چھوڑتے کیوں ہو

بکھر نہ جائیں حسیں واقعات کی کڑیاں
تصوّرات کی زنجیر توڑتے کیوں ہو

کسی کی روح اندھیروں میں ڈوب جائے گی
ندی مین دیپ عقیدت کا چھوڑتے کیوں ہو

تمہارے پاس جو اَمرِ کی ایک بونْد نہیں
تو خواہشات کی لاشیں جھنجھوڑتے کیوں ہو

وہ آدمی توفرشتوں میں ہوچکا شامل
تم اسکا نام مرے ساتھ جوڑتے کیوں ہو

☆☆☆

بھٹک رہی ہے یہاں روح چِترؔ لیکھا کی
نہ ان قدیم گپھاؤں میں سادھوؤ ٹھہرو

☆

اس شہر میں الفاظ کی یلغار بہت ہے
ہر شخص یہاں غازیِ گفتار بہت ہے

سیکھو نہ زمانے سے فنِ دست درازی
مجوب کوئی صاحبِ دستار بہت ہے

جم جاؤں تو ہو آلۂ آہن بھی شکستہ
کٹ جاؤں تو لکڑی کی بھی تلوار بہت ہے

گزرے ہوئے لمحات سے منہ پھر لیں کیسے
ٹوٹے ہوئے رشتوں سے ہمیں پیار بہت ہے

ساحل سے سلگتے ہوئے پتھر نہ اچھالو
دریا کفِ امواج میں بیدار بہت ہے

زنداں سے رہائی کا تو امکاں نہیں لیکن
زنجیر مرے پاؤں سے بیزار بہت ہے

معلوم ہے تم کس کا پتا پوچھ رہے ہو
وہ شہر میں مشہور تو ہے خوار بہت ہے

☆☆☆

دیارِ سنگ میں رہ کر بھی شیشہ گر تھا میں
زمانہ چیخ رہا ہے کہ بے ہنر تھا میں

بہ فیضِ گوشہ نشینی جہاں بسر تھا میں
نظر تھی بامِ اُفق پر اور اپنے گھر تھا میں

لگی تھی آنکھ تو مریم کی گود کا تھا گماں
کھلی جب آنکھ تو دیکھا صلیب پر تھا میں

اماں کِسے تھی مرے سائے میں کہ رکتا کوئی
خود اپنی آگ میں جلتا ہوا شجر تھا میں

تمام عمر نہ لڑنے کا غم رہا مجھکو
عجب محاذ پہ ہارا ہوا ظفر تھا میں

ہوائے وقت نے پتھر بنا دیا ورنہ
لچکتی شاخ سے ٹوٹا ہوا ثمر تھا میں

تمام شہر میں جنگل کی آگ ہو جیسے
ہوا کے دوش پہ اُڑتی ہوئی خبر تھا میں

☆☆☆

مذہبوں کی چادریں اوڑھے خدا کے ساتھ ہیں
شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتّے ہوا کے ساتھ ہیں

صرف سوکھے ناریل ہیں مفلسوں کے ہاتھ میں
کھڑکیاں مندر کی سب دستِ رسا کے ساتھ ہیں

دستکوں کے زاویوں میں فرق کیا محسوس ہو
آہٹوں کے قافلے آوازِ پا کے ساتھ ہیں

گُل کھلائے گی کوئی نیرنگیِ سنگ و زجاج
آئینے بھی آزرِ سنگ آشنا کے ساتھ ہیں

عینِ ایمان ہے برنگِ ہوش یہ دیوانگی
دیر و کعبہ چھوڑ کر بندے خدا کے ساتھ ہیں

کل نظر بچتے ہی واعظ تھے درونِ میکدہ
ہم سمجھتے تھے، کہ ہم کس پارسا کے ساتھ ہیں

خاک شُد عرضِ تمنّا ختم شُد ذوقِ وصال
جب کُھلا ہم پر کہ جنسِ ناروا کے ساتھ ہیں

☆☆☆

غبارِ صحین میں ہے شور سائبان میں ہے
شکست و ریخت کا منظر مرے مکان میں ہے

حصارِ سنگ سے نکلے تو جوئے شیر بنے
کہ تیشہ زن کا پسینہ ابھی چٹان میں ہے

نہ فاصلے نہ ہواؤں کی مسئلہ سازی
''سفر گزار'' پرندہ ابھی اڑان میں ہے

بجا کہ وقت نے سب کچھ بدل دیا لیکن
لہو کا ذائقہ اب بھی مری زبان میں ہے

ہر ایک نقشِ کفِ پا ہے انتشار لیے
سراغِ سمتِ سفر جانے کس نشان میں ہے

طلوع ہوگا نئے عہد کا نیا سورج
یہ سرخ سرخ اجلا جو آسمان میں ہے

خبر نہیں کہ یقیں کی ہے کون سی منزل
وہ اعتبار گزیدہ عجب گمان میں ہے

بھٹک نہ جاؤں اندھیروں میں رہ نمائی کر
کہ منزلوں کا اجالا تری زبان میں ہے

☆☆☆

عروضی غزل

ادراکِ خودی کا یہ اثر ہے
آئینہ خودی اپنی زد پر ہے

تصویر کشِ صحرا گھر ہے
کیا سازشِ دیوار و در ہے

منظر منظر زہر اثر ہے
نیلاہٹ تا حدِّ نظر ہے

پی جاؤ صداقت کا تلخاب
اس زہر میں اَمرِت مضمر ہے

تصویریں عریاں ہیں پسِ رنگ
گستاخ بہت دستِ ہُنر ہے

کیا دے کوئی زخموں کی داد
اپنا دل اپنا خنجر ہے

صدیوں کا اندھیرا ہے سرِ راہ
ہر چند کہ تو مہر بسر ہے

آنکھوں میں ہے جشنِ بے خوابی
گو گھر کی فضا خواب آور ہے

شک ہو تو اک ضرب لگا دیکھ
پتّھر میں پوشیدہ شرر ہے

موجوں میں لیے دردِ مساوات
دریا ہوں صحرا پہ نظر ہے

آندھی نے سنّیاس لیا تھا
برگد کیوں بے برگ و ثمر ہے

☆☆☆

بروزن رباعی

شب زاد اندھیروں سے سحر پیدا کر
اس رات کی دیوار میں در پیدا کر

ساحل سے صدا دے تو سمندر بولے
آواز میں اتنا تو اثر پیدا کر

دشوارِیِ حالات سے کیا بیزاری
ہرحال میں جینے کا ہُنر پیدا کر

دل گہرا سمندر ہے کسی شام کھنگال
پلکوں کے لیے سلکِ گُہر پیدا کر

بے رمز و کنایات غزل کیا معنی
مفہوم ۔ بہ الفاظِ دِگر پیدا کر

اس موڑ پہ تھک ہار کے بیٹھا کیا ہے
پھر جذبۂ تکمیلِ سفر پیدا کر

بے نام جزیروں کا پتا دے یارب
پانی میں کوئی راہ گزر پیدا کر

خاموش ہیں اخبار مرے بارے میں
اے دوست کوئی تازہ خبر پیدا کر

اذہان پہ میری ہی حکومت کیوں ہے
اے وقت کوئی اہلِ ہُنر پیدا کر

☆☆☆

بروزن رباعی

مفہوم و معانی کی گزر گاہ لگے
لفظوں کا سمندر مجھے بے تھاہ لگے

ہونے کو ہے سب دشتِ خلا میں تحلیل
اب راحتِ جاں لمحۂ جاں کاہ لگے

ہم رنگِ فقیری میں تہی دست کبھی
اوقات پہ آئے تو شہنشاہ لگے

میں ایسے دُو راہے پہ کھڑا ہوں کہ جہاں
اس سمت لگے غار اُدھر چاہ لگے

اس جسمِ جہاں ساز کو سر کرنے میں
بستر پہ شہنشاہ بھی کم جاہ لگے

میں بکھرا تو یک چشمِ زدن میں بکھرا
سمٹا تو سمٹنے میں کئی ماہ لگے

سورج کو بھی مغرب سے نکلتا دیکھوں
مصروفِ دُعا کاش وہ بدخواہ لگے

ہم جراتِ رفتار کا دم بھرتے ہیں
مشکل سے کہوں اور کسی راہ لگے

وہ عجزِ مُریدی سے کہاں تھے واقف
جن لوگوں کو ہم راندۂ در گاہ لگے

☆☆☆

براوزانِ رباعی

بے دست و سروپا ہے اندھیروں کی قطار
پھر چوم رہا ہے شہِ خاور تلوار

اب قیدِ رگ و پے میں لہو ہے بیزار
گرتی ہے تو گرجائے بدن کی دیوار

اٹھا ہے سرِ راہ کدھر سے یہ غبار
مصروفِ سفر ہے کوئی توسن نہ سوار

دیوارِ نگاہ پر ہے تصویرِ بہار
کچھ نقشِ گل و شاخ ابھی اور نکھار

ماضی کی گزر گاہ کبھی کر روشن
یادوں کے سفر پر بھی نکل جا اک بار

تعبیریں دروازے پہ دینگی دستک
خوابوں کے حصار میں کوئی شب تو گزار

دریائے مناظر کی تہوں میں تو اتر
اپنی ہی نگاہ سے تو کیوں ہے بیزار

ہر نقشِ نہاں رنگِ نمو چاہتا ہے
تصویرِ کائنات ابھی اور سنوار

محجوب ہوئے اپنی ہی نادانی پر
ہوتے نہ خجل کاش جو رہتے خوددار

☆☆☆

نذرغالب

رحتِ سفر گردِ صد غبارِ سفر ہو
تاکہ مجھے پاسِ اعتبارِ نظر ہو

اہلِ سفر جادہ ہائے خود خبری میں
شرط یہ ہے آگہی نہ بارِ سفر ہو

گم ہے نظر جگنوؤں کی در بدری میں
جیسے کوئی جشنِ انتشارِ شرر ہو

سرخیِ اخبار کو وہ حرف و نوا دے
شورِ خموشی بہ انحصارِ خبر ہو

ابرِ گہر بارِ دوشِ دشت و ہوا ہے
چشمِ صدف صرفِ انتظارِ گہر ہو

پائے جنوں دشت میں یہ خفتہ روی کیوں
رفتِ قدم حسبِ رہ گزارِ سفر ہو

بعد ترے نکتہ دانِ بزمِ سخن میں
کاش کوئی تجھ سا طرحدارِ نظر ہو

☆☆☆

نذرِ غالب

حسبِ جنوں ہے زمیں یہ تنگ نہیں ہے
تارِ نظر آسماں پتنگ نہیں ہے

مجھ سے مرے ساحلوں پہ دست نبردی
موجِ بلا اتنی بھی دبنگ نہیں ہے

کیا ہے خبر فتح میں شکست نہاں ہو
وجہِ سکون انتہائے جنگ نہیں ہے

اسکو بہرحال ہے تہوں میں اتر نا
پیشِ نظر خوفِ صد نہنگ نہیں ہے

کھو کے کہیں آئے ہو تم اپنا ہی چہرہ
گھر کے کسی آئینے پہ زنگ نہیں ہے

سنگ صفت ہر زجاجِ قصرِ نظر ہو
شیشہ نواز اب وہ شہرِ سنگ نہیں ہے

رفتِ قلم دیکھ تنگنائے غزل میں
تجھ پہ کہیں قافیہ تو تنگ نہیں ہے

☆☆☆

بابِ رباعیات

پروازِ مسلسل سے تھکا جسم ٹٹول
پھر تاب و تواں خواہشِ بسیار پہ تول
چیخ اٹھیگا بے جان پرندے کا لہو
باہر کی ہوا تیز ہے دروازہ نہ کھول

☆

تحسیرِ تحرّک میں شرارے خاموش
تابانیِ پیہم کے نظارے خاموش
وہ صبطِ مسلسل ہے کہ آنسو ہیں نہ آہ
آنکھوں کی ندی چپ ہے کنارے خاموش

ہر رنگ ہر اک لمحہ عجب رنگ میں تھا
لگتا تھا کہ جادو کوئی انگ انگ میں تھا
پہلو جو بدلتا تھا وہ آئینہ بدن
طوفانِ معانی کسی فرہنگ میں تھا

☆

وسعت سے جو تنگ آئے تو گھیرے میں ملے
تاریک وسیہ رات کے ڈیرے میں ملے
افلاک سے بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح
بے جسم و قبا سائے اندھیرے میں ملے

انانیّت پیروں میں تھی زنجیرِ فضول
وہ سیم وزر ہر گام مسافت میں تھے شول
میں خود اپنا ''اجداد نگر'' چھوڑ آیا
وراثت میں جاگیر مجھے کب تھی قبول

☆

دشمن کا نہ کر ذکر کہ شہرت ہوگی
رسوائے جہاں خود تری عظمت ہوگی
جُڑ جائے گا نام اُس کا ترے نام کے ساتھ
عزّت ہے تری اس کی بھی عزّت ہوگی

خود آگ رہے جن کے تلے پوشیدہ
وہ پاوں ہوا کرتے ہیں چیدہ چیدہ
اوہام کی بھٹّی میں سُلگنے والے
زنجیر نہیں موئے شرارہ دیدہ

☆

ہم خود کے پرستار خوی کے طالب
الفاظ کی یلغار ہماری جانب
جس راہ سے آئے ہو اُسی راہ لگو
ہم خاک نشینوں سے نہ الجھو صاحب

دل کی جب مہمان ہوا کرتی ہے
جینے کا سامان ہوا کرتی ہے
دیوانو اس رزم گہہِ ہستی میں
ہر خواہش وردان ہوا کرتی ہے

☆

احساس پہ ہر ضربِ صدا تو لیں گے
صد راز خدا یانِ زمیں کھولیں گے
اب ٹوٹ نے والی ہیں خموشی کی حدیں
کچھ دیر میں پتّھر کے صنم بولیں گے

شعلہ بہ نفس درد بہ بازو آیا
پھر طائرِ جاں تشنۂ خوشبو آیا
ہے کوئی معطّر سرِ دشت و صحرا
یا ناف میں سرمایۂ آہو آیا

☆

زہرِ غمِ ادراک پیئے بیٹھا ہوں
تحصیرِ غمِ ذات کیئے بیٹھا ہوں
در آئے نہ آنکھوں میں کوئی موجِ سراب
اس خوف سے پلکوں کو سیے بیٹھا ہوں

سوتا ہوں تو سوتے سے جگا لیتی ہے
روتا ہوں تو چپکے سے رُلا لیتی ہے
دل میں تو نہیں اٹھتی کوئی ٹیس مگر
آنسو یہ مری آنکھ بنا لیتی ہے

☆

کل تو کل یہ آج بھی میرا نہ ہوا
راہوں سے کیوں دور اندھیرا نہ ہوا
سورج تو رہا شانہ بہ شانہ لیکن
صدیوں کی اس شب کا سویرا نہ ہوا

بازار سے گھر تک ہے گرانی کا کمال
ٹکسال پہ بھاری ہے سِکّے کا زوال
مزدور کو ہو کیسے میسّر روٹی
مطبخ میں خموشی ہے نہ آٹا ہے نہ دال

☆

گفتار میں غازی ہے تو لہجے میں دھمک
صد آئینہ بردار ہے چہرے کی چمک
سچّا تو ہے رکھتا نہیں منہ میں سونا
راشی ہے مگر کھاتا ہے آٹے میں نمک

دشمن نہیں مشفق نہیں غم خوار نہیں
یعنی کہ تمہارا کوئی کردار نہیں
تم مجھ سے محبت کی توقع نہ رکھو
تم تو مری نفرت کے بھی حقدار نہیں

☆

ہر عہد ہر اک رسم سے منہ موڑ گیا
رشتے وہ گھڑی بھر میں سبھی توڑ گیا
رہ رہ کے جو اٹھتا ہے خلوت میں دھواں
بنجارہ کہیں آگ دبی چھوڑ گیا

ازہانِ صنادید نے عیّاری کی
اسلاف نے آئین سے غدّری کی
ہر عہدِ رواں قوم پہ بھاری گزرا
لمحات نے صدیوں سے ریا کاری کی

☆

اندھیروں نے شب بھر جو بھگوئی شبنم
گلابوں پر تھک ہار کے سوئی شبنم
سویرے کے سورج نے بھی کی من مانی
شعاعوں کے تاروں میں پروئی شبنم

عالم تو کجا ٹھیک سے جاہل بھی نہیں
اخلاق میں تشریف کشِ دل بھی نہیں
میں مدح کروں اُس کی خاکم بہ دہن
تعریف تو کیا ہجو کے قابل بھی نہیں

☆

پیپل کی کوئی شاخ نہ توڑی ہوتی
برگد کی کلائی نہ مروڑی ہوتی
عنوانِ بزرگی کا بھرم کھل جاتا
خواہش کی اَمر بیل نچوڑی ہوتی

ہولی ہے گاؤں میں نہ رنگ ہے نہ پھاگ
اپنو کی بھیڑ میں بچھڑ گیا سہاگ
سیندوری مانگ میں بھری ہوئی ہے ریت
سانسوں کے تار میں سُلگ رہی ہے آگ

☆

رستے سے ہٹو چال کے اندر تو بلاو
مخصوص جو مہماں سے ہے کمرہ وہ دکھاو
منظور ہے یک مشت سلامی لیکن
ماہانہ کرائے میں زیادہ ہے گھٹاو

کیوں گوشۂ تحقیق بہ محشر کھلتا
کیوں دفترِ اسرار سرِ سر کھلتا
ہر قصّۂ پارینہ ہوا تشت از بام
اے کاش نہ یہ گنبدِ بے در کھلتا

☆

چپکے سے کسی شام کو ہجرت کرلیں
دہلیزِ مقدس کی زیارت کرلیں
ایمان ہے پختہ تو سفیرانِ حرم
میخانے میں آجائیں عبادت کرلیں

اشکوں میں تحلیل ہوئی ڈھلتی شام
یادوں کا اُس پار اٹھا ہے کُہرام
موجوں نے دریا پہ لکھی خاموشی
ساحل پر تحریر ہوا تیرا نام

☆

تصویرِ تحیّر ہیں زجاج و معمار
ہے فرش بہ لرزش تو دھڑکتی دیوار
ہر چہرے پہ چہرہ ہے برائے چہرہ
خود آئنہ خانہ ہے صداقت بیزار

ہے خون پسینے سے اٹی جوے بدن
وادی کی فضا میں ہے ابھی بوے بدن
محصورِ سرِ سنگ ہے تیشے کی دھمک
کہسار میں محفوظ ہے نیروے بدن

☆

یہ زلف جو تیری سرِ بازو کھل جاے
تقدیرِ نہاں خانۂ خوشبو کھل جاے
درنافہ غضب سنج نہ ہو مشکِ بلا
زنجیرِ خفا خانۂ آہو کھل جاے

خود ہی سے بچھڑ آیا ہوں ان جانے میں
خاموش اندھیرا سا ہے ویرانے میں
کیا ڈھونڈتی ہے شام کی یہ تنہائی
کچھ بھی تو نہیں دل کے نہاں خانے میں

☆

بے روح رہی عشق میں چہرے کی پھبن
تا عمر رہا عیش کا ساماں یہ بدن
اب حشر میں کیا فیصلہ ہو رب جانے
فریاد سے ہم رشتہ ہے تیرا دامن

آ کاش کے تاروں میں عجب پھیر ہوا
پھر چاند کی عصمت کا مکاں ڈھیر ہوا
دھرتی کے فرشتوں نے کیا کارِ گناہ
کل رات بھرے شہر میں اندھیر ہوا

☆

شب بھر کا لکھا دستِ سحر میں دیکھا
جو شہر میں گزرا تھا وہ گھر میں دیکھا
جب صبح کے اخبار کی سرخی دیکھی
خوابوں میں نہ دیکھا جو خبریں دیکھا

اُس رات کا سچ مجھ سے اگر تو کہتی
یہ کربِ مسلسل نہ یوں تنہا سہتی
دامن پہ لگے داغ سبھی ڈھل جاتے
اے کاش تری آنکھ سے گنگا بہتی

☆

بے فیض کی یہ نطق فروشی کیسی
تصویرِ تحیّر یہ خموشی کیسی
وہ کچھ بھی کہے اور سنو تم بیٹھے
اے یار یہ ہے پنبہ بگوشی کیسی

مضامین و قصائد کا یہی ہیں عنوان
دبستانِ ادب کی ہے انھیں سے پہچان
بس اک غالبؔ خستہ سے ہے بازارِ سخن
دمِ میرؔ سے چلتی ہے غزل کی دُکّان

☆

اطراف میں کیا ہے انہیں معلوم نہیں
موجودِ جہاں ہم بھی ہیں معدوم نہیں
اب نقد کے میدان میں کچھ اہلِ قلم
مکّار ہیں چالاک ہیں معصوم ہیں

ہم نیند سے جاگے تو رباعی لکھ دی
سنسار سے بھاگے تو رباعی لکھ دی
رقاصۂ تخئیل کے پیروں میں کبھی
بندھنے لگے دھاگے تو رباعی لکھ دی

☆

افلاک سے دھرتی پہ اُچھالا کیوں تھا
آتش کدۂ دہر میں ڈالا کیوں تھا
اب مائلِ دوزخ ہوں تو حیراں کیوں ہے
تو نے مجھے جنّت سے نکالا کیوں تھا

بیگانۂ احساس تھا شیشے کا بدن
بیدار کیا ہم نے تو جاگی یہ چبھن
تو طاق میں رکھا ہوا آئینہ تھا
ہم نے ہی سکھایا تجھے جینے کا چلن

☆

پیغام کوئی تم کو دیا تو ہوگا
جاتے ہوئے کچھ اُس نے کہا تو ہوگا
اے خانۂ بے نور کی دیوارو بتاو
کس حال میں تھا تم کو پتا تو ہوگا

آندرے ژید کی نذر

آسان کو دشوار بنا دیتا ہے
کیوں راہ میں تصویر بچھا دیتا ہے
پاؤ نگی تجھے تیرے وسائل سے تو پھر
تو کیوں مجھے زردم کا پتا دیتا ہے

☆

ایوانِ رباعی کو سجانے والے
حُسّاد کو اک آنکھ نہ بھانے والے
چوبیس ہی کافی تھے بھکنے کے لیے
چوراسی اوزان بنانے والے

رباعیات

اور

چوراسی اوزان بہ التزام

"سبب پئے سبب است و وتد پئے وتد است"

رباعی کے نئے اوزان صاحبانِ فن کی نذر

جمنا پرشاد راہی

انکشاف

اساتذہ نے عروض کی کتابوں میں صنفِ رباعی کے چوبیس اوزان، دس ارکان، اورنو زحافات اس طرح تحریر کئے ہیں، مفاعلین سالم، مفعولُ، اخرب، مفعولن اخرم، مفاعیلُ، مکفوف، مفاعلن مقبوض، فاعلن اشتر، فعولن اہتم، فعل مجبوب، فاع اہزٖ، اودفع ابتر، میرے خیال میں یہی ارکان وزحافات قارئینِ عروض کی گم رہی کا باعث ہیں مذکورہ دس ارکان اورنو زحافات بحرِ ہنرج کےتو ہوسکتے ہیں، رباعی کےنہیں۔

دراصل اوزان رباعی میں نہ کوئی رکن سالم ہے، نہ اخرم ہے، نہ اشتر ہے، نہ اہنر ہے، اور نہ ابتر، اوزانِ رباعی میں صرف پانچ ارکان اور چھ زحافات ہیں، اوروہ ہیں مفعولُ، اخرب، مفاعیلُ ومکفوف، مفاعلن مقبوض، فعولُ اہتم، اورفعل مجبوب ان پانچ ارکان میں جس زحاف کے باعث تغیرو تبدیلی واقع ہوتے ہیں وہ ہے ''تسکین اوسط'' تسکین اوسط کی وجہ سے ہی مندرجہ بالا ارکان کی دس صورتیں وجودمیں آتی ہیں جواساتذہ نےتحریرکی ہیں، صرف ارکان کی صورت دیکھ کرزحافات کاتعیّن کرنا رباعی میں یکسر غلط ہے۔

اساتذہ نے یہ بھی تحریر کیاہے کہ مذکورہ ارکان کی اُلٹ پھیر سے

رباعی میں چوبیس اوزان کے علاوہ ہزاروں اوزان وضع کیے جاسکتے ہیں، یہ بات بھی قرینِ قیاس نہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ صدر وابتدا اور حشوین میں اگر ارکان کی اُلٹ پھیر کی جائے تو کافی حد تک اوزان میں اضافہ ممکن ہے۔

مثلاً صدر وابتدا میں مفعولُ کی جگہ مفاعلن مقوض یا مفاعیلُ مکفوف رکھ لیا جائے تو چوبیس کے علاوہ اوزان وضع کیے جاسکتے ہیں، صرف عروضی چابکدستی کی ضرورت ہے، اوزانِ رباعی میں یہ خیال رکھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ عروض وضرب میں بغیرِ تسکینِ اوسط فعول کی جگہ فاع یا فعل کی جگہ فع لانا قطعی جائز نہیں ہے، اسی طرح حشوین میں مفاعلن مقبوض یا فاعلن مقبوص مسکّن کے بعد مفعولُ یا مفعولن لانا بھی غلط ہوگا۔

میں نے اوزانِ رباعی میں ارکان کی اُلٹ پھر سے پورے ساٹھ اوزان کا اضافہ کیا ہے یعنی چوبیس کی جگہ چوراسی اوزان کر دیئے ہیں۔ اور ”سبب پئے سبب است ووتد پئے وتد است“ کا پابند رہا ہوں، بہ قول طوسیؔ یہی اوزانِ رباعی کی شناخت ہے۔ جو رباعیات چوراسی اوزن میں کہی ہیں ان کے ذیل میں ہر رباعی کا وزن بھی تحریر کیا ہے۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں۔

عروض کا طالب علم

جمنا پرشاد راہیؔ

اخرب

(۱)

کیسی ہے یہ مصلحت یہ کیسی ہیں قیود
نادیدہ حصار میں مقیّد ہے وجود
شب زاد اندھیروں کے مقابل ہیں چراغ
تحریکِ جہاد میں نہ شعلہ ہے نہ دود

مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعول

(۲)

مچھلی نے کُتر دیا مچھیرے کا جال
ناگن بھی سمجھ گئی سپیرے کی چال
پروانے بھی پی گئے چراغوں کا تیل
گِرگِٹ نے بھی اوڑھ لی شرافت کی شال

مفعولُ مفاعلن مفاعلن فاع

(۳)

ہستی یہ حباب ہے مری جانے بلا
جینا جو عذاب ہے مری جانے بلا
یہ فکرِ جہاں اور یہ سانسوں کی گھٹن
پیالے میں شراب ہے مری جانے بلا

مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعل

(۴)

سب کھیل بگڑ گیا تو پھر کیا ہوگا
ٹانکا یہ اُدھر گیا تو پھر کیا ہوگا
یک قطرۂ خوں اور ہے باقی دل میں
کل وہ بھی نبڑ گیا تو پھر کیا ہوگا

مفعولُ مفاعلن مفاعلین فع

(۵)

اے دشتِ ہوا زاد کے تخمینہ گزار
مت بھول کہ ہے تجھ پہ زمیں کا بھی اُدھار
ماضی سے ہی روشن ہے ترا مستقبل
گزرے ہوئے لمحات کا بھی قرض اُتار

مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفعول

(۶)

دروازہ کُھلا شام کا در آئی رات
کمرے کی فضا مہکی جو لہرائی رات
کچھ دیر رہی دوشِ ہوا پر رقصاں
پھر چاند کے شانوں پہ اُتر آئی رات

مفعولُ مفاعیلُ، مفاعیلن فاع

(۷)

پھر سنگ بہ منقار ابابیل اُڑے
تنکے کی طرح شاخِ تنِ فیل اُڑے
مکڑی کے تحفظ میں رہے غارِ حرا
مسجد کے کنوئیں سے نہ کوئی چیل اُڑے

مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعل

(۸)

کچھ ہم ہیں فسوں کار تو ساحروہ بھی
بازیچہ گرِ خاص ہے آخروہ بھی
ہم شعبدہ گر ہیں تو وہ ہے بازی گر
کٹھپتلی نچانے میں ہے ماہروہ بھی

مفعولُ مفاعیلُ مفاعلین فع

(۹)

یوں راہ کے پتّھر کو ٹھوکر نہ لگاو
کچھ سنگ رموزی کا احسان اٹھاو
یہ راہ نہیں آساں اُس راہ چلو
پتّھر کا اشارہ ہے اِس سمت نہ جاو

مفعولُ مفاعلین مفعولُ فعول

(۱۰)

بنتی ہیں بگڑتی ہیں تصویریں دیکھ
پانی پہ اُبھرتی ہیں تحریریں دیکھ
اک آن میں کھو بیٹھتی ہیں اپنا وجود
نادان یہ موجوں کی تقدیریں دیکھ

مفعولُ مفاعیلن مفعولن فاع

(۱۱)

بھگوان کے گہنوں سے دستار بھری
اِک پاپ کی گھڑی تھی سو بار بھری
پوجا میں دیکھی جو کوئی دوشیزہ
مندِر کے پُجاری نے ھُنکار بھری

مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعل

(۱۲)

آنکھوں میں جھلکتا ہے ویرانہ سا
صورت سے نہیں لگتا دیوانہ سا
کرتی ہے طواف اُس کا زمانے کی نظر
لیکن وہ جہاں سے ہے بیگانہ سا

مفعولُ مفاعلین مفعولن فع

(۱۳)

پلکوں کی چھاؤں میں سحابوں کا ہجوم
اشکوں میں تیرتے حبابوں کا ہجوم
کمرے میں بھٹکتی ہیں پرانی یادیں
آنکھوں میں رات ہے کہ خوابوں کا ہجوم

مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعول

(۱۴)

دریائے یاس کا وہ گہرا منجھدھار
ساحل پر ریت کی وہ گرتی دیوار
ہے یاد وہ موجوں سے الجھتی کشتی
ماجھی کے ہاتھ میں وہ ٹوٹی پتوار

مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع

(۱۵)

لیلیٰ کے خواب کی بھی تعبیر ملی
مجنوں کے پاوں کی بھی زنجیر ملی
نکلی جو ہوا نجد کے صحرا کی طرف
منظر میں خاکِ سر ہمہ گیر ملی

مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعل

(۱۶)

کمروں تک آگ ہے پگھل جاؤ گے
ٹھہرو گے صحن میں تو جل جاؤ گے
یہ خانۂ ہستی ہے مقفّل لیکن!
دیواریں توڑ دو نکل جاؤ گے

مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

(۱۷)

جوتوں میں بانٹو نہ وراثت کا پلاو
اِس گرتی دیوار پہ کچھ رحم بھی کھاو
گھر زیور پیسہ سب تقسیم کرو
میں کس کے حصّے کی اٹھنّی ہوں بتاو

مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعول

(۱۸)

آنکھوں میں ڈوبے تو شناور بن جاے
پلکوں میں سمٹے تو سمندر بن حاے
تنگی میں، تجھے ضبط کی ہو تاب اگر
آنسو بھی گوہر کے برابر بن جاے

مفعولن مفعولُ مناعلین فاع

(۱۹)

تو سُن کر سکتے میں نہ آ جائے کہیں
کھو بیٹھے تعبیر ترا خوابِ حسیں
کیا کھوٹ ہے کردار کے آئینے میں
کہہ دوں تو پیروں سے نکل جائے زمیں

مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعل

(۲۰)

کرنے دے موسم کو ابھی من مانی
آنکھوں کو دریا کی دِکھا ویرانی
ہے ضبطِ مسلسل کا تقاضا کہ ابھی
ہونٹوں پر ہو پیاس گھٹا میں پانی

مفعولن مفعولُ مفاعیلن فع

(۲۱)

پتّھر میں خود مہکیں خوابوں کے گلاب
جھرنوں کا پانی بھی بن جائے شراب
آکاش پہ ظاہر ہو تخیّل کی دھنک
تخلیقی جذبے پر آنے دے شباب

مفعولن مفعولن مفعولُ فعول

(۲۲)

دریا کی تہہ میں تھے چمکیلے خواب
آنکھوں میں در آئے کیوں نیلے خواب
منتھن کر پھر دل کی گہرائی کا
شِوبن کر پی جا سب زہریلے خواب

مفعولن مفعولن مفعولن فاع

(۲۳)

سینے میں پوشیدہ طوفان ملا
آنکھوں میں سہما سا ارمان ملا
پتّھر کی مورت نے جب لب کھولے
باتوں میں غالبؔ کا دیوان ملا

مفعولن مفعولن مفعولُ فعل

(۲۴)

ہاتھوں میں زخموں کی ہیں تحریریں
لکھّی ہیں ہم نے ہی خود تقدیریں
حاصل ہیں وحشت کی خودداری کا
لپٹی ہیں پیروں میں جو زنجیریں

مفعولن مفعولن مفعولن فع

۲۴ ؍اوزانِ مروجہ ختم شد

رباعی کے نئے اوزان

(۲۵)

تدوینِ خس وخاک کیا کرے غبار
رہ رہ کے سرِ راہ اٹھا کرے غبار
روکے مجھے رستے میں اسے تاب کہاں
آندھی میں نہ ہو زور تو کیا کرے غبار

مفعولُ مفاعیلُ مفاعلن فعول

(۲۶)

صحرا کا سمندر سے سلسلہ نہ جوڑ
محتاطِ تعلق ہو دائرہ سکوڑ
سیراب نہ ہوپاے گی یہ پیاسی زمیں
خود کو نہ سخاوت کی راہ میں نچوڑ

مفعولُ مفاعیلن فاعلن فعول

(۲۷)

لب کھولیں کچھ اہلِ منافقت بتائیں
ہم سے ہے کس درجہ مخاصمت بتائیں
اندازۂ تفریق تعلق ہو جاے
کتنی ہے قربت میں مفاصلت بتائیں

مفعولن مفعولُ مفاعلن فعول

(۲۸)

ساحل پر خاموشی بو چلی ہے رات
دریا کی موجوں میں سو چلی ہے رات
میلوں تک پھیلا ہے گھنا سنّاٹا
صدیوں کی تنہائی ہو چلی ہے رات

مفعولن مفعولن فاعلن فعول

(۲۹)

معراجِ بلندی سے گرا دیا مجھے
خاکسترِ عالم میں ملا دیا مجھے
دامن ہی ملا کوئی نہ دریا کی عُمق
اے چشمِ گُہر بار یہ کیا دیا مجھے

مفعولُ مفاعیلُ مفاعلن فعل

(۳۰)

نشّے میں خودی کے سرشار ہوگئے
خود سے بھی زیادہ خوددار ہو گئے
انساں ہی سے انساں کی توقع جو اُٹھی
کچھ لوگ تو آدم بیزار ہوگئے

مفعولُ مفاعیلن فاعلن فعل

(۳۱)

جانی ہی تھی جان تو جی لیے تھے کیوں
خاموشی کے گھنوٹ وہ پی لیے تھے کیوں
کیوں قید ہو پتّھر میں عصا سنج بتاو
چشم ولب اک ساتھ یہ سی لیے تھے کیوں

مفعولن مفعولُ مفاعلن فعل

(۳۲)

اشکوں کی تحریریں بے زباں نہ لکھ
اِک بھولا افسانہ رائیگاں نہ لکھ
خط پڑھ کر پلکوں پر ساون نہ سجا
کاغذ پر بارش کی داستاں نہ لکھ

مفعولن مفعولن فاعلن فعل

(۴۳)

تفریقِ قبیل کیا کہ قافلہ ہے ایک
تہذیب و نفوس کا بھی رابطہ ہے ایک
اک شاخ ہے وابستۂ تطہیر و نمود
مت بھول ترا مرا یہ سلسلہ ہے ایک

مفعولُ مفاعلن مفاعلن فعول

(۴۴)

سانسوں کے تار میں الجھ گئی حیات
مجبوری قید ہے تو بے بسی نجات
پروانہ رہائی کا آیا نہ ہنوز
زنداں میں آج بھی گزر گئی یہ رات

مفعولن فاعلن مفاعلن فعول

(۳۵)

بے کیف جو شور ہے تو خامشی سنو
تاریک یہ رات ہے تو راستہ چُنو
بیکار گنوا بیٹھو نہ جینے کا ہنر
تعبیریں اگر نہیں تو خواب ہی بُنو

مفعولُ مفاعلن مفاعلن فعل

(۳۶)

پانی کی جنگ جب چھڑی کگار سے
خائف تھے شورِ سیلِ بے شمار سے
کیا کرتے ساحل پہ کھڑے کھرپنوار
پتھر جب کٹ گئے ندی کی دھار سے

مفعولن فاعلن مفاعلن فعل

مقبوض

(۳۷)

نصیب ہی تعلق میں رہا وجہِ فتور
یقین کر سیہہ قدر کی سازش ہے ضرور
بچھڑ گئے جو ہم دشتِ جہاں سازی میں
نہیں خطا کوئی تیری نہ ہے میرا قصور

مفاعلن مفاعیلُ مفاعیلُ فعول

(۳۸)

جھلس رہے ہیں جھیلوں میں برسات کے خواب
زباں بہ لب پرندے بھی ہیں پابہ رکاب
اے آسماں ترے ظلم اٹھائے کب تک
زمین کے دُکھوں کا بھی ہے کوئی حساب

مفاعلن مفاعیلن مفعولُ فعول

(۳۹)

غنیم کا تو سینے پہ ہی لینا ہر وار
کہ دیش کا جو ہے قرض چکا دینا یار
محاذ پر سپاہی کا ہے دھرم یہی
کٹے جو سر تو کٹ جائے نہ چھوٹے تلوار

مفاعلن مفاعیلُ مفاعیلن فاع

(۴۰)

ہیں نشۂ شرابِ حق میں ہم سرشار
ہے مستعد سرِ کربل لشکر بیدار
مہک اٹھے ہیں جسموں پر زخموں کے پھول
زبان کی زمینوں پر اُگ آئیں خار

مفاعلن مفاعیلن مفعولن فاع

(۴۱)

یہ شامِ غم دبے پاوں گزر جائے کبھی
نصیبِ شب گھڑی بھر کو سنور جائے کبھی
زمیں پر اُتر آئے کبھی کاہکشاں
لباسِ غم نگاہوں سے اُتر جائے کبھی

مفاعلن مفاعیلُ مفاعیلُ فعل

(۴۲)

وہ بات پھر زمانے میں مشہور نہ کر
کہ شہر سے نکلنے پر مجبور نہ کر
کُرید مت یہ مشکل سے بھر پائے ہیں
خموش رہ کہ زخموں کو ناصور نہ کر

مفاعلن مفاعیلن مفعول فعل

(۴۳)

بنا بنا کے عالم کو مٹانا ہے کیا
اگر یہ ہے حقیقت تو فسانہ ہے کیا
یہ رازِ خود سری تیرا قیامت انداز
تو ہی بتا تری خُلق نے جانا ہے کیا

مفاعلن مفاعیلُ مفاعیلن فع

(۴۴)

تلاش میں کہاں کوئی آیا ہوگا
فریب خود نگاہوں نے کھایا ہوگا
شروع سے اندھیرا ہے سر راہِ فرار
یہاں کہاں تعاقب میں سایہ ہوگا

مفاعلن مفاعیلن مفعولن فع

(۴۵)

ہرے بھرے وہ منظر ہیں نہ پات ہیں نہ پھول
یہ کیا ہوا کہ اُگ آئے چہار سو ببول
جھلس اٹھی ہے آنکھوں میں ہر شاخِ شجر
نگاہ کے بھی پیروں میں کھٹک رہے ہیں شول

مفاعلن مفاعیلُ مفاعلن فعول

(۴۶)

نہ ماجرائے تعزیرِ مقدرات ہے
نہ ابتدائے تفسیر غمِ حیات ہے
ہے آگہی بہ دشتِ جاں محصورِ قلم
جو ڈھل گیا رباعی میں وہ کربِ ذات ہے

مفاعلن مفاعیلُ مفاعلن فعل

(۴۷)

بدل گیا وہ ہم محور دوستی کی راہ
بہ اعتبار و خوش فہمی دل ہوا تباہ
خجِل ہوا میں خود اپنی نادانی پر
خراجِ گم رہی ٹھہرا عشقِ بے پناہ

مفاعلن مفاعیلن فاعلن فعول

(۴۸)

ہمہ طرف جو تھا روشن وہ نہاں ملا
وجود میں خود اپنے ہی اک جہاں ملا
سمٹ گیا تھا کب مجھ میں اک عالم اور
زمینِ دل کُریدی تو آسماں ملا

مفاعلن مفاعیلن فاعلن فعل

مکفوف

(۴۹)

اندھیرا ہے چہارسو نہ سورج نہ چراغ
بھٹکتی ہے نگاہ تو سُلگتا ہے دماغ
نکل جاؤں نہ میں دشتِ بدن سے باہر
ان آنکھوں کو کہیں ترا نہیں ملتا سراغ

مفاعیلُ مفاعلن مفاعیلُ فعول

(۵۰)

نہیں مٹتی جہاد سے یہ تاریکی جاگ
یہ خس خانہ بچا کے رکھ نہ لگ جائے آگ
یہ دنیا ہے گھر پھونک تماشہ مت دیکھ
اندھروں کے دیار میں نہ گا دیپک راگ

مفاعیلُ مفاعلن مفاعیلن فاع

(۵۱)

وہ روشن سا چراغ ہے سیہہ فام نہیں
ضیا اس کی ہے صحن میں لبِ بام نہیں
سرِ قصرِ تلاش ہے ادھوری پہچان
ہے چہرہ تو نگاہ میں مگر نام نہیں

مفاعیلُ مفاعلن مفاعیلُ فعل

(۵۲)

وہ موسم نہ بہار کے پلٹ کر آئے
جو روٹھے تھے نہ لوٹ کر کبھی گھر آئے
جوانی کی کگار سے اتر آئی ندی
بڑھاپے کی ڈھلان پر سمندر آئے

مفاعیلُ مفاعلن مفاعیلن فع

(۵۳)

فراوانیِ گل ہے کہ شروعاتِ زوال
سوالاتِ عجب رنگ کا محور ہے خیال
بہاروں کا جس شاخ پہ ہے شورِ نمود
گراں بارِ خزاں بھی ہے وہی شاخِ نہال

مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعول

(۵۴)

دوپہری ہے غضب ناک بلا کی ہے دھوپ
سبیلوں کو نہیں آب ہیں پیاسے نل کوپ
درختوں کے گھنے سائے سفر میں ہیں مگر
ببولوں نے چناروں کا بھرا ہے بہروپ

مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلن فاع

(۵۵)

عناداریِ پیہم کی مثالوں سے ملو
ہتھیلی پہ اگے چند سوالوں سے ملو
زیافت میں کسی قصدِ ستم زاد کے ساتھ
کبھی آؤ مرے ہاتھ کے چھالوں سے ملو

مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعل

(۵۶)

مہاجن کے لٹھیتوں سے پٹی پگڈنڈی
بجوکا نے بھی گھبرا کے گرادی جھنڈی
تحافیظِ تقدّم میں لگا کھیت کو آگ
دلالوں نے بھی کل رات جلادی منڈی

مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلن فع

(۵۷)

طلب گارِ تعیش ہیں یک جنس دونام
بدل نے کو ہیں آمادہ فطرت کا نظام
خدایا کچھ ان کی بھی سزا کر تجویز
شیاطین کے پیرو ہیں خواہش کے غلام

مفاعیلُ مفاعیلن مفعولُ فعول

(۵۸)

غریبوں کو ستاتا ہے گدڑی میں کال
شہنشاہ کو ڈستی ہے مخمل کی شال
فقیری میں کٹے یا ہو بسر شاہی میں
بہرحال یہ جیون ہے جی کا جنجال

مفاعیلُ مفاعیلن مفعولن فاع

(۵۹)

اساطیرِ گزشتہ کی تفسیر کروں
حکایات کا سودا کیوں سرگیر کروں
ازل ہی سے اگر عشق خدا ہے تو پھر
مناجات بہ شکوہ کیا تحریر کروں

مفاعیلُ مفاعیلن مفعولُ فعل

(۶۰)

ستاروں میں اگر رقصاں مہ زادی ہے
تو پھر نور کی چادر کیوں تنوادی ہے
میسّر ہو سخاوت میں کوئی عکسِ بدن
یہ آئینۂ فطرت بھی فریادی ہے

مفاعیلُ مفاعیلن مفعولن فع

(۶۱)

یہ دانائی ہے تجھے اگر وہم گزار
تو ماضی سے مانگ لے وہ بچپن ہی اُدھار
اُترنا ہے اگر پار تو بے خوف و خطر
یہ کاغذ کی کشتیاں سمندر میں اتار

مفاعیلن فاعلن مفاعیلُ فعول

(۶۲)

طہارت ہے داو پر ہے خطرے میں دین
اماوس کی رات کا سفر ہے سنگین
ہے مشکل میں کدھر جائے سنہری ناگن
تلہٹی میں بج اٹھی سپیرے کی بین

مفاعیلن فاعلن مفاعلین فاع

(۶۳)

عماراتِ سنگ میں نہ کر شیشہ گری

یہ فن پارے ٹاٹ میں ہیں پیوندِ زری

صناعت میں کہاں انہیں ہے فہم و ادراک

قصیرانِ عقل کو نہ دے دردِ سری

مفاعیلن فاعلن مفاعیلُ فعل

(۶۴)

مساجد کے قلب میں شوالے رکھ جا

حدیثوں میں ویدوں کے حوالے رکھ جا

بھٹکتے ہیں بے سمتِ منازل کچھ لوگ

اندھیروں کی راہ میں اجالے رکھ جا

مفاعیلن فاعلن مفاعیلن فع

(۶۵)

بریدہ سر ہے لاش تو خنجر بھی نکال
ہے پیروں میں زنجیر تو پھر سر بھی نکال
کناں دست یہ پیوندِ عمارت ہے کون
حویلی سے پہچان کا پتّھر بھی نکال

مفاعیلن مفعولُ مفاعیلُ فعول

(۶۶)

سمندر کر صحرا کی ہواؤں کے پانو
جھلستے ہیں کیوں حمد سراؤں کے پانو
رسائی دے تکمیلِ شہادت ہوجائے
کہ زخمی ہیں معصوم دعاؤں کے پانو

مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن فاع

(۶۷)

درِ خستہ خود قُفل سے بیزار ہوا
ضعفی کا ہر اینٹ کو آزار ہوا
فصیلوں کی دراروں نے ہوا دے ڈالی
پرانا گھر آثار پہ جب بار ہوا

مفاعیلن مفعولُ مفاعیلُ فعل

(۶۸)

عمارت کے سب رنگ اتر جانے دے
یہ آندھی یہ برسات گزر جانے دے
عزیز اتنا بھی ہر نقشِ صنادید نہ رکھ
یہ خم خوردہ آثار بکھر جانے دے

مفاعیلن مفعولُ مفاعلین فع

(۶۹)

سجی پھر شب پھر پھٹکا آکاش نے سوپ
ستاروں نے پھر چھانی احساس کی دھوپ
جلادیں آ بستر پہ اُگی ناگ پھنی
شراروں نے دھارا ہے جذبات کا روپ

مفاعیلن مفعولن مفعولُ فعول

(۷۰)

سلگتی ہے کس درجہ تنہائی ناپ
کہاں تک ہے کس غم کی پہنائی ناپ
اتر نا ہے دریاوں کی تہہ میں جو تجھے
کسی دل کے صحرا کی گہرائی ناپ

مفاعیلن مفعولن مفعولن فاع

(۷۱)

خود آئینے پتھر کی تمثیل ہوے

سمندر بھی صحرا میں تحلیل ہوے

یہ جادو ہے اخلاص و وفاداری کا

حقیقت میں افسانے تبدیل ہوے

مفاعیلن مفعولن مفعولُ فعل

(۷۲)

سمندر دے موجیں دے طغیانی دے

تلاطم دے خشکی دے یا پانی دے

ہوا تیری مستول نشیں بھی تو ہے

کنارہ دے یا موسم طوفانی دے

مفاعیلن مفعولن مفعولن فع

(۷۳)

فصاحت دے بلاغت نہ نصاب سے نکال
قوانین و قواعد کے عذاب سے نکال
کبھی فکر کے جزدان سے دے آزادی
کبھی فہم و فراست کی کتاب سے نکال

مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعلن فعول

(۷۴)

ہدف تک تو وہ جائے گا چل چکا جو تیر
لہو میں بھی نہائے گا چل چکا جو تیر
نہ کر خود کو خجل ہو نہ پریشاں ناحق
پلٹ کر تو نہ آئے گا چل چکا جو تیر

مفاعیلُ مفاعیلن فاعلن فعول

(۷۵)

کسانوں کے چہرے پہ کِھلا کِھلا وہ نور
وہ گوری کی پازیب وہ چنگ اور صور
کُھلے نیلے آکاش پہ وہ قوسِ قزح
وہ ست رنگی تصویر نگاہ سے ہے دور

مفاعیلن مفعولُ مفاعلن فعول

(۷۶)

اندھیرے میں کرتے ہیں مولوی خلال
گلاتا ہے پنڈت بھی رات ہی میں دال
جگاتے ہیں جو فجر میں اذان و ناقوس
مچلتی ہے بستر میں رات کی چھِنال

مفاعیلن مفعولن فاعلن فعول

(۷۷)

جفاکش تھا وفادارِ زُجاج ہوگیا
وہ پتّھر سے خود آئینہ مزاج ہوگیا
بدلنے کی ادا خوب مگر وقت کے ساتھ
تلوّن طرفی طرفہ رواج ہوگیا

مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعلن فعل

(۷۸)

نگارستاں بگڑے کہ سنور گے بتا
وہ سب چہرے سمٹے کہ بکھر گے بتا
بچایا تھا کل گردِ کدورت سے جنہیں
وہ آئینے ٹوٹے کہ نکھر گے بتا

مفاعیلن مفعولُ مفاعلن فعل

(۷۹)

تخیّل کی زمینوں پر ریت کے ہیں گھر
غباروں کی فصیلیں ہیں صحن ہیں نہ در
نظر میں ہیں یہ اسرارِ مآلِ ہستی
مناظر میں مکینوں کے جسم ہیں نہ سر

مفاعیلُ مفاعلین فاعلن فعل

(۸۰)

مرے دل کا کچھ حصّہ مرگیا تو ہے
خلاسا کچھ پہلو میں کرگیا تو ہے
وہ پہلا سا غم ہے نہ خوشی ہے یعنی
کوئی خالی پیمانہ بھرگیا تو ہے

مفاعلین مفعولن فاعلن فعل

(۸۱)

کسی لمحہ نصیب سے سوال کرتو دیکھ
کوئی فال کتاب سے نکال کر تو دیکھ
نتیجے کی نہ کر فکر عمل کر نادان
کوئی سِکّہ زمین پر اچھال کر تو دیکھ

مفاعیلُ مفاعلن مفاعلن فعول

(۸۲)

پشیماں خود ابر ہے ہوائیں ہیں اداس
بہ ہر لمحہ دشت کی بھی بڑھ رہی ہے پیاس
سرابوں کی توقع سے پرے ہے بارش
سمندر بھی ہو چلا ہے تشنہ گی شناس

مفاعیلن فاعلن مفاعلن فعول

(۸۳)

یقیں آے کسی پہ اب نہ دل کہیں ٹھکے
زیارت کو بہ ہر قدم یہ آسماں جھکے
بہرگام لپٹ جائے پیروں سے زمیں
ترے در سے جو اٹھ گیا وہ پھر کہاں رکے

مفاعیلُ مفاعلن مفاعلن فعل

(۸۴)

سماعت کو آگ سے گزار دے کوئی
کہ شعلے پھر کان میں اتار دے کوئی
وہ لودیتی آواز کہیں سے آئے
مجھے میرے نام سے پکار دے کوئی

مفاعیلن فاعلن مفاعلن فعل

ایک نظم آنے والی کتاب سے

مرے ہندوستان
تعریف تیری، لکھوں کیسے کہ لفظ کو زباں ملتی نہیں ہے
نظر خاموش سی ہے
قلم بے چین سا ہے
ہزاروں فکر کے سورج درخشاں ہو گئے ہیں
اشارہ کر رہے ہیں
میں تیری مدح لکھوں
تجھے لکّھوں حسیں خوابوں کی جنت
تجھے لکّھوں جہانِ خیر و برکت
تجھے لکّھوں اُجالوں کا سمندر
کوئی تجھ سا کہاں ہے، تو بحرِ بے کراں ہے
اک ایسا آسماں ہے
کہ جس کی سبز پیشانی پہ ہیں زندہ لکیریں
جو اکثر بولتی ہیں،
اٹھا کر چاند رکھ دیتی ہیں آئینوں کے آگے
مسلسل سوچتی ہیں،

تری نازک ہتھیلی پر کئی صدیاں ہیں لرزاں
ترے مضبوط بازو پر ہزاروں نام لکّھے ہیں
تری تاریخ کے اوراق بوسیدہ ہیں لیکن!
سنہرے لفظ اب بھی بولتے ہیں
صد اسرارِ شجاعت کھولتے ہیں
ترے مضبوط شانو پر غنیموں نے ہزاروں زخم بوئے ہیں
مگر ہر زخم سے اُگتا ہوا سورج بتاتا ہے
کہ تو نے دشمنوں کو بھی محبت سے نوازا ہے
ترے دامن کے سائے میں کئی تہذیب کے پیکر ہیں زندہ
ترے کعبہ کلیسہ اور شوالے گواہی دے رہے ہیں
کہ تو انسانیت کا ہے پجاری، اہنسا دھرم ترا،
محبت تیرا مذہب
مرے ہندوستان تعریف تیری،
لکھوں کیسے کہ لفظوں کو زباں ملتی نہیں ہے۔

☆☆☆



آج سے پچیس تیس سال پہلے اردو کی کلاسیکی غزل کے ہزار بارہ سو سال پرانے علائم واستعارات، بیان واظہار کے ذرائع ابلاغ وترسیل کے وسائل سے جزواًیا کلیۃً منہ موڑ لینے کے بعد اردو کی جدید غزل جن نئی راہوں پر گامزن ہوئی ان راہوں میں کہیں تو غزل کی گردن ہی مار دی گئی، کہیں مختلف طریقوں سے اس کی مٹی پلید کی گئی اور کہیں اس کو مداری کا کھیل یا نٹ کا تماشہ بنا کر رکھ دیا گیا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ بعض شعراء نے نہ صرف غزل کا بھرم قائم رکھا بلکہ اس کے نئے امکانات بھی دریافت کیے۔ دنیائے شعروادب کی اس دادوگیر میں جمنا پرشاد راہیؔ نے جو روش اختیار کی اور ندرت وتازگی، صحت وسلامت، اور تہہ داری ومعنویت کے لحاظ سے جس طور پر غزل سرا ہوئے اس کی مثال میرے خیال میں ذرا مشکل سے ملے گی۔

وقت کے طویل فاصلے کی بنا پر ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ادبی ماحول سے راہیؔ کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوسکا جو ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ کلاسیکی روایاتِ غزل کے اثرات ان کے یہاں تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ لیکن۔ ان کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ادبی وشعری قلابازیوں اور نام نہاد جدیدیت کے نت نئے کرتبوں کی جانب ان کا رویہ مکمل بے نیازی، بلکہ حقارت آمیز بے رخی کا رویہ رہا۔ اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ ظاہر ہے۔ ان کی شاعری تجربات، ذرائع اظہار، ڈکشن اور لہجے کے لحاظ سے مکمل طور پر ان کی اپنی شاعری ہے، نادر الوضع اور منفرد الاسلوب! جس میں سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ عدمِ ابلاغ کی لعنت سے بالکل پاک ہے، راہیؔ صاحب قارئین وسامعین کو صفحۂ ہستی سے نابود خیال نہیں کرتے۔ ان کے یہاں وہ ادبی نمک حرامی مفقود ہے کہ گرد وپیش کی دنیا سے جو کچھ ہتھیا سکتے ہو ہتھیا لو، اور اس کے بدلے میں کچھ نہ دو۔ وہ لعل اُگلتے ہیں مگر اپنے لیے کم، دوسروں کے لیے زیادہ!

اخترؔ انصاری